یا اللہ مدد — اصلی کلمہ اسلام: لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ — حق چار یار





مجلہ صفدر

شیخ الحدیث حضرت مولانا
محمد سرفراز خان صفدر نور اللہ مرقدہ

حضرت مولانا
قاضی مظہر حسین نور اللہ مرقدہ

111-112

مئی رجون 2020 — رمضان المبارک رشوال المکرم

ختم نبوت اور ناموس رسالت پر شب خون کے حوالے سے موجودہ حکومت کی یہ کوئی پہلی شرارت وخباثت نہیں، اس سے قبل بھی کئی مذموم کوششیں ہو چکی ہیں۔ بعض جہاں دیدہ حضرات کا کہنا ہے کہ: ہمارے حکمرانوں نے اپنے مغربی آقاؤں سے وعدہ کر رکھا ہے کہ ہم آئینی طور پر قادیانیت کو اسلام تسلیم کریں گے۔ جب اہل مغرب ان کو یہ وعدہ یاد دلاتے ہیں تو وہ کوئی ایسا شوشہ چھوڑ کر بھوکی پیاسی قوم کی دینی غیرت کا درجہ حرارت چیک کرتے ہیں۔ اور قوم کا جذبہ اور شدید ردعمل دیکھ کر اپنے آقاؤں سے کہتے ہیں: ہم تو آپ کے غلام ہیں، لیکن یہ قوم نہیں مانتی، اس لیے ابھی مزید انتظار کرنا ہوگا۔

لہٰذا جب تک مسلم قوم اپنا جذبہ جواں اور کان کھلے رکھے گی، ختم نبوت وناموس رسالت جیسے حساس مسائل میں اتحاد واتفاق کا دامن تھامے رہے گی، ان شاء اللہ کوئی مائی کا لعل اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ [اقلیتی کمیشن میں قادیانیوں کو شامل کرنے کی منظوری: ۳]

مظہریہ دار المطالعہ
0312 4612774 0334-4612774
khadim.khan4@yahoo.com

ترتیب

وفیات

......قائد اہل سنت مولانا قاضی مظہر حسینؒ کی صاحبزادی، حافظ مختار الحسن صاحب کی اہلیہ رحمہا اللہ [چیچہ وطنی]

......حضرت جہلمیؒ کے بھتیجے، جناب پروفیسر حافظ خالد محمود صاحب کے فرزند عبید اللہ رحمہ اللہ [کھینگر مدال]

......شیخ الحدیث مولانا عبد القدوس قارن مدظلہم کے برادر نسبتی محمد علیم قاسم صاحب رحمہ اللہ [گوجرانوالہ]

......حضرت امام اہل سنتؒ کے ہم زلف عبد الحمید مرحوم کے داماد حافظ عبد الرشید رحمہ اللہ [گوجرانوالہ]

......پروفیسر عمر اسعد صاحب کے بڑے بھائی طارق صاحب رحمہ اللہ [تلہ گنگ]

......مولانا حبیب الرحمٰن سومرو مدظلہم کی خالہ محترمہ رحمہا اللہ [سندھ]......مولانا قاری عبید الرحمٰن کی دادی محترمہ رحمہا اللہ [پڑھنہ، مانسہرہ]......مدثر بلال کے والد محترم صفدر صاحب رحمہ اللہ [چکوال]

قارئین سے مرحومین کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کی درخواست ہے۔

پیامِ صفدر　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　مدیر کے قلم سے

غیرتِ مسلم زندہ ہے/کورونا/مولانا طارق جمیل کی معافی: مقام عبرت

مؤرخہ ۲۹/اپریل ۲۰۲۰ء کو بعض ذرائع نے یہ خبر نشر کی کہ: ''۲۱/اپریل کو موجودہ حکومت کی وفاقی کابینہ کے اجلاس میں بعض اراکین کی تجویز پر وزیر اعظم پاکستان عمران خان نے پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اقلیتی کمیشن میں قادیانیوں کو شامل کرنے کی منظوری دے دی ہے۔'' اِس خبر کے عام ہوتے ہی بجا طور پر اسلامیان پاکستان کے مذمتی بیانات اور تند و تیز تنقید کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شدید عوامی ردِ عمل کو دیکھتے ہوئے دو حکومتی اراکین نے جھوٹ کا سہارا لیا اور اِس خبر کی سختی کے ساتھ تردید کر دی۔ لیکن اگلے ہی روز سرکاری دستاویزات منظر عام پر آ گئیں، جس سے حکومتی اراکین کا سفید جھوٹ عیاں ہو گیا۔ مسئلہ کی حساسیت کے پیش نظر اِس جھوٹ کی قباحت و شناعت عام جھوٹ سے کہیں زیادہ ہے، جس نے سفید ریش وفاقی وزیر مذہبی اُمور جناب نور الحق قادری کے دامن پر نہ مٹنے والا ایک اور دھبہ لگا دیا ہے۔　ع　شرم تم کو مگر نہیں آتی!

ختم نبوت اور ناموس رسالت پر شب خون کے حوالے سے موجودہ حکومت کی یہ کوئی پہلی شرارت و خباثت نہیں، اِس سے قبل بھی کئی مذموم کوششیں ہو چکی ہیں۔ بعض جہاں دیدہ حضرات کا کہنا ہے کہ: ہمارے حکمرانوں نے اپنے مغربی آقاؤں سے وعدہ کر رکھا ہے کہ ہم آئینی طور پر قادیانیت کو اسلام تسلیم کریں گے۔ جب اہل مغرب ان کو یہ وعدہ یاد دلاتے ہیں تو وہ کوئی ایسا شوشہ چھوڑ کر بھوکی پیاسی قوم کی دینی غیرت کا درجہ حرارت چیک کرتے ہیں۔ اور قوم کا جذبہ اور شدید ردِ عمل دیکھ کر اپنے آقاؤں سے کہتے ہیں: ہم تو آپ کے غلام ہیں، لیکن یہ قوم نہیں مانتی، اس لیے ابھی مزید انتظار کرنا ہو گا۔

لہٰذا جب تک مسلم قوم اپنا جذبہ جواں اور کان کھلے رکھے گی، ختم نبوت و ناموس رسالت جیسے حساس مسائل میں اتحاد و اتفاق کا دامن تھامے رہے گی، اِن شاء اللہ کوئی مائی کا لعل اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

کیا موجودہ حکومت کی کسی بھی قسم کی تائید، حمایت یا طرف داری خصوصاً عمران خان کو ''اچھا انسان'' کہنے کا کوئی جواز کسی غیرت مند اور باضمیر مسلمان کے لیے باقی رہ گیا ہے!؟

کورونا: جان سے زیادہ ایمان اور عقیدے کی حفاظت ضروری ہے۔

اخباری اطلاعات اور دیگر ذرائع کی پیش کردہ معلومات کا کہنا ہے کہ: موجودہ دنیا کے آباد حصے کی

اکثریت ''کورونا'' نامی وبا سے متاثر ہے۔ یکم مئی کے اخبارات کے مطابق پاکستان میں کورونا کے مریضوں کی تعداد ۱۶۲۷۶/اور مجموعی اموات ۳۶۱/ ہیں۔ جبکہ دنیا بھر میں متاثرین کی تعداد ۳۲/لاکھ ۴۰/ہزار اور اموات ۲/لاکھ ۳۰/ہزار ہیں، صحت یاب ہونے والوں کی تعداد ۱۰/لاکھ ۳۰۰/رہے۔ [روزنامہ اسلام، یکم مئی ۲۰۲۰ء جمعہ]

وَبا کا عذاب:

الحمدللہ ثم الحمدللہ ہمارا عقیدہ و ایمان ہے کہ دنیا بھر کے تمام معاملات خدا تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ وہی قادر ہے، وہی متصرف ہے۔ انسان کے دِل سے لے کر ہواؤں اور طوفانوں تک ہر چیز پر اُسی کا کامل اختیار ہے۔ جب بندے اپنے رب کو خوش کرتے ہیں تو خالق و مالک اُن کے حالات سدھار دیتا ہے اور جب لوگ خالق کی نافرمانی پر تل جاتے ہیں تو رب تعالیٰ مختلف طریقوں سے اُنھیں جھنجھوڑتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد ہے کہ: وبائیں اللہ تعالیٰ کا عذاب ہوتی ہیں، جسے اہل ایمان کے لیے رحمت بنا دیا جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کے باوجود جاوید چوہدری جیسے دین اور مذہب دشمن لوگ کہتے ہیں کہ: ''وبائیں عذاب نہیں ہوتیں!'' یقیناً آقا علیہ السلام کا فرمان سچا اور بہر حال سچا ہے، جبکہ جاوید چوہدری جھوٹا اور حقیقتاً جھوٹا ہے۔

لڑنا نہیں جھکنا......مقابلہ نہیں محاسبہ!

ہمارے جاہل و بے دین حکمرانوں کا طرزِ عمل بھی خدا کے مزید عذاب کو دعوت دینے والا ہے، زلزلہ آجائے یا سیلاب، یہ بے وقوف اُسے ''چیلنج'' کے طور پر قبول کرتے اور اس سے ''مقابلے'' کی ٹھان لیتے ہیں۔ بدنام زمانہ پرویز مشرف نے ۲۰۰۵ء کے زلزلہ میں اور اَب عمران خان نے کورونا وَبا میں یہی طرزِ عمل اختیار کیا ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ اگر والد بیٹے کو یا استاذ شاگرد کو کسی غلطی پر تنبیہ کرتے ہوئے اصلاح احوال کے لیے سزا دے، اور بیٹا اسے ''چیلنج'' کے طور قبول کر کے مقابلہ بازی پر اتر آئے تو کیا وہ اپنی دنیا و آخرت برباد نہیں کر ڈالے گا؟ چہ جائے کہ خالق و مالک کی سزا کے بارے میں ایسے خیالات رکھے جائیں۔ حقیقت میں یہ وقت اپنے 'محاسبہ' کا وقت ہے کہ توبہ و استغفار کر کے اصلاح احوال کی طرف توجہ کی جائے۔

آزمائش یا عذاب؟

علماء دین فرماتے ہیں کہ: کسی بھی قسم کی پریشانی، تکلیف، بیماری اگر انسان کو خدا کی طرف متوجہ کرے، خدا کے قریب کر دے تو وہ بیماری اُس انسان کے لیے آزمائش ہے جو بالآخر خدا کی رحمت ثابت ہوگی۔ جیسا کہ طاعون بہت سے صحابہ کے حق میں رحمت ثابت ہوا۔ اور اگر مصیبت انسان کو خدا سے دُور کر دے، نماز، روزے، مسجد اور فکر آخرت سے دُور کر دے تو یہ مصیبت ایسے انسان کے لیے عذابِ الٰہی

ہے۔ اِس ضابطے کی روشنی میں بہ آسانی فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ: موجودہ وَبا کس کے لیے عذاب ہے اور کس کے لیے آزمائش!؟

موت تو ہر حال میں آنی ہے، ایمان کی حالت میں اللہ سے ملاقات لکھی ہے تو اِس سے بڑی سعادت کوئی نہیں! اور پھر ایسی موت جس کے بارے میں ''شہادت'' کا ثواب ملنے کی نوید سنائی گئی۔ لہٰذا مسلمان کے لیے تو یہ موت ''نعمتِ عظمیٰ'' ہے۔ اِس لیے مسلمانوں کو اِس موت سے بھی ڈرنا نہیں چاہیے۔

کورونا کی آڑ میں مذہب نشانے پر!

ہمارے حکمرانوں اور سیکولر طبقات نے اِس وبا کی آڑ میں مذہب اور اہل مذہب کو ایسے نشانے پر رکھ لیا ہے جیسے گویا ان کی لاٹری نکل آئی ہو۔ کبھی تبلیغی جماعت پر بے جا الزامات، کبھی مساجد و مدارس کی بندش کے احکامات، کبھی علماء و ائمہ کی گرفتاری اور جمعہ وغیرہ روکنے کے لیے علماء پر ریاستی اِداروں کا دباؤ!

حالانکہ نماز اور جماعت جہاد کے دوران بھی معاف نہیں، حتی الامکان اسے ادا کرنے کا ہی حکم ہے۔ طاعون جیسے وبائی امراض کے سلسلہ میں ہمارے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور صحابہ کرام کی زندگیوں میں واضح ہدایات موجود ہیں۔ ایسے مواقع پر نہ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ترکِ جماعت کی اجازت دی نہ ہی صحابہ کرام نے طاعون کے باوجود کہیں ایسا کوئی اقدام فرمایا۔ حضور اور صحابہ کو چھوڑ کر کون سی ''شریعت'' ہے جس سے ہمارے حکمران راہ نمائی لے رہے ہیں؟

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص فجر با جماعت پڑھ لے وہ اللہ کی ضمانت میں آ جاتا ہے۔ ہمارے حکمرانوں اور بے دین طبقات کو اصل پریشانی ہی یہی ہے کہ مسلمان کا رخ اور توجہ اپنے خالق کی طرف کیوں ہے؟ ہماری طرح امریکہ و یورپ کی طرف کیوں نہیں؟ وہ کیوں ابھی تک خدا کو ہی سب کچھ تسلیم کرتا ہے؟ خدا کی ضمانت اور حفاظت کو اپنے لیے کافی کیوں سمجھتا ہے؟ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ذِکر، دعا، نماز، صدقہ وغیرہ کے ذریعہ بلاؤں کو دُور کرو، یہ انبیاء و اولیاء کی سنت ہے۔ ہمارے عقل بندوں کو یہ تشویش ہے کہ: مسلمان ترقی یافتہ دور میں ابھی تک انبیاء کی سنت ہی سے کیوں وابستہ ہے؟

ایسے میں عصر حاضر کے ملحد و زندیق جاوید غامدی کو بھی یاد آ گیا کہ مسلمانوں کو عبادات سے دُور کرنے کے لیے میں نے ہر سال کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑنا ہوتا ہے، ایک سال تراویح کے انکار کا شوشہ چھوڑا، دوسرے سال کرکٹ کی وجہ سے روزوں کی کسی اور مہینے میں منتقلی کا۔ اِس سال شیطانی اجتہاد کا ایک اور بہترین موقع ہاتھ آ گیا، لہٰذا آن لائن جماعت کا شوشہ چھوڑ دیا۔ غامدی صاحب کو چاہیے کہ ''لاک ڈاؤن'' کے عرصہ میں کھانا بھی آن لائن کھا لیا کریں، بیماری کا علاج بھی آن لائن دوا سے کر لیں، دوسری تمام ضرویات زندگی بھی آن لائن ہی پوری کر لیں! تاکہ جماعت کی خاطر گھر سے نکلنے کا جواز ہی ختم ہو جائے۔

امت مسلمہ کے لیے اصل عذاب جاوید غامدی، جاوید چوہدری اور ان جیسے دوسرے ملحدوں کی ''دانش وَری کا عذاب'' ہے۔ جو ہروقت قوم کو خدا سے دُور اور یورپ سے قریب کرنے کے لیے فکرمند رہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے: مساجد کو ویران کرنے کی کوشش کرنے والے سے بڑا ظالم کون ہوسکتا ہے؟

احتیاطی تدابیر سے زیادہ عقیدے کی حفاظت ضروری ہے:

احتیاطی تدابیر اختیار کرنا اچھی بات ہے، لیکن احتیاطی تدابیر کے ضمن میں عقیدہ خراب کرنا بڑی خسارے کی بات ہے، ہمیں یہ تلقین تو کی جاتی ہے کہ دن میں کئی بار صابن سے ہاتھ دھولو! لیکن ساتھ یہ کیوں نہیں کہا جاتا کہ: یہ عقیدہ بھی رکھو کہ: اگر خدانخواستہ ہاتھ کو جراثیم لگ گئے ہیں تو اُن کو صابن نے نہیں، اللہ نے اپنے حکم سے دُور کرنا ہے؟ اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ: احتیاطی تدابیر کے ذریعہ ہم تقدیر سے نہیں بھاگ سکتے، ہاں! اپنے دِل کو تسلی ضرور دے سکتے ہیں۔

دُعائیں نعمت ہیں:

مسلمانوں کو اللہ پاک نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے بہت قیمتی دعائیں عطا فرمائی ہیں۔ یہ مومن کا ہتھیار ہیں۔ اہل ایمان کے لیے مضبوط قلعے ہیں۔ خدا کی ضمانت اور فرشتوں کی حفاظت کا ذریعہ ہیں۔ لہٰذا مسلمان تو دعاؤں کے پیچھے ہی بھاگیں گے۔ جو لوگ ایمان کی نعمت سے محروم ہیں، وہ بیماریوں سے بچنے کے لیے کوئی اور پناہ گاہ تلاش کریں!

کرنے کے کام:

موجودہ حالات میں ضروری ہے کہ ہم خدا تعالیٰ کے سہارے کو ہی مضبوط پکڑیں اور درج ذیل اُمور کو لازم کرلیں:

۱۔ وہم وخوف کا خاتمہ۔ صبر اور یہ یقین کامل کہ یہ بیماری خدا کی طرف سے ہے۔

۲۔ یومیہ اعمال کا نظام الاقات مرتب کر کے فرصت کے لمحات کو ضائع ہونے سے بچانے کی سرتوڑ کوشش۔ ٹی وی اور میڈیا کے عذاب سے دُوری اور بہت دُوری۔

۳۔ رجوع الی اللہ: عقائد، اعمال، اخلاق کی اصلاح۔ ترک معاصی: خصوصاً سود، ڈاڑھی مونڈنے اور بے پردگی کے گناہ سے پکی سچی توبہ۔ نیکیوں میں اضافہ: صدقہ خیرات، کثرتِ درود شریف، استغفار۔

۴۔ مساجد ومدارس کو آباد کرنے اور آباد رکھنے کی پوری کوشش۔ دنیا کی بہترین جگہیں مساجد ہیں۔

۵۔ اہل ایمان سے صلہ رحمی کا اہتمام، قطع رحمی کا خاتمہ۔

۶۔ اپنے اہل خانہ اور بچوں کو سیرتِ نبوی اور سیرتِ صحابہ اور اسلامی عقائد واَقدار سے آگاہی۔

۷۔موت کی مکمل تیاری: معاملات کی صفائی،قرضوں اور دیگر حقوق العباد کی ادائیگی، وصیت نامہ لکھنے کا اہتمام، دِل میں رب سے ملاقات کا شوق۔ موت آجائے تو محض اَمرِ ربی سمجھنا۔

۸۔غرباءوضرورت مندوں کا بھرپور خیال۔ مدارس ومساجد کے ساتھ ہر قسم کا تعاون۔

۹۔عقیدہ ختم نبوت، ناموس رسالت، ناموس صحابہ اور دیگر شعائرِ اسلام کے حوالے سے حساسیت، کسی بھی منفی وغیر مناسب اقدام کی بھرپور مذمت اور جان توڑ مزاحمت۔ دین نے باقی رہنا ہے، دین کا دفاع کرنے والے مبارک اور رحمان کا گروہ ہیں۔ جبکہ مخالفت کرنے والے نامبارک اور شیطان کا گروہ ہیں۔

۱۰۔مسنون دعاؤں کا اہتمام اور پھر کامل بھروسہ۔

مولانا طارق جمیل کی میڈیا سے معافی، مقام عبرت!

مؤرخہ ۲۳؍اپریل ۲۰۲۰ء بروز جمعرات کو وزیر اعظم پاکستان کی جانب سے قائم کردہ ''کورونا ریلیف فنڈ'' میں عطیات جمع کرنے کے لیے ایک پروگرام منعقد ہوا، جس میں مولانا طارق جمیل نے بھی شرکت کی، دورانِ گفتگو انھوں نے کہا کہ: ''صرف پاکستان کی بات نہیں، پوری دنیا کا میڈیا جھوٹا ہے۔ سب سے زیادہ جھوٹ بولا جاتا ہے۔'' اور یہ بھی کہا کہ: ''ایک ٹی وی چینل کے مالک نے انھیں کہا تھا کہ: اگر چینل سے جھوٹ ختم ہو جائے تو چینل ہی ختم ہو جائے گا۔'' مولانا طارق جمیل صاحب کا میڈیا کے حوالے سے یہ دعویٰ بالکل مبنی بر حقیقت ہے، خصوصاً دینی اَقدار اور اہل دین کے حوالے سے میڈیا کی اکثریت کا جھوٹ، یک رُخا پن، دھوکہ اور حقائق سے چشم پوشی ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ لیکن افسوس کہ: مولانا طارق جمیل میڈیا جیسے عفریت کے طنز و تشنیع اور تیز و تند تنقید کے سامنے اپنے اِس سچ پر قائم نہ رہ سکے اور ڈھیر ہو گئے۔ چنانچہ ایک ایک صحافی کو فون کر کے معافی مانگی، مولانا کی جو ریکارڈنگ ہم تک پہنچی، درج ذیل ہے:

''دنیا میں کوئی ایسا انسان نہیں جو خطا سے پاک ہو، بڑے سے بڑا علامہ ہو، زاہد ہو، شیخ ہو۔ نبی کے سوا ہر آدمی کی زبان لڑکھڑاتی ہے، اور یہ انسانی فطرت ہے اور اس کا اعتراف نہ کرنا یہ شیطانیت ہے۔ میں اتنا بولتا ہوں، اتنا بولتا ہوں۔ میں اپنے اِن کلمات کو جسٹی فائی نہیں کر رہا، بلکہ معذرت کر رہا ہوں۔ حامد میر صاحب سے بھی میں معافی چاہتا ہوں، آپ سے بھی اور دوسرے بیٹھے ہیں ان سے بھی، مولانا طاہر اشرفی صاحب بیٹھے ہیں، آپ سب سے، جو بھی میڈیا سے متعلق ہیں، میں آپ سب سے معافی چاہتا ہوں،.... میری کوئی دلیل نہیں، مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔...... (مذکورہ ٹی وی چینل کے مالک کے حوالے سے کہا کہ) یہ معاملہ پرسنل ہے، ایک آدمی کی غلطی اور غلط بول ہے، اس کو میڈیا پر کہنا غیبت ہے، میں یہ نہیں بتاؤں گا، لیکن میں یہ حلفاً کہتا ہوں کہ: ٹاپ ٹین میں سے ایک نے کہا۔ آپ نام کی معذرت قبول کریں۔ اور جو مجھ سے غلطی ہوئی، میں اس کا اعتراف کرتا ہوں۔...... (میزبان کے مزید سوال پر کہا کہ:) بھائی مالک! میں تو

پہلے ہی اعتراف کر چکا ہوں، اَب آپ اس کو کیوں دوہرا رہے ہیں؟......اُس وقت سے میں نے اِن کا نمبر ڈھونڈنا شروع کیا، میں نے کوئی اِن کو دس کال کی، لیکن یہ مصروف تھے، میں نے کامران شاہد کو بھی ڈائریکٹ فون کر کے معذرت کی ہے، معافی مانگی ہے، جاوید چوہدری کو کل ہی میں نے معذرت کردی تھی، اور بھائی حامد صاحب، شکر ہے بیٹھے ہوئے ہیں، ان سے بھی اور آپ سے بھی، جتنے بھی ہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں، اعتراف کے بعد مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ میرا سرنڈر ہے۔ میں اپنی اس چیز کی کوئی دلیل نہیں پیش کر رہا...... بھائی مالک! آپ کیوں بات لمبی کر رہے ہیں، جب میں نے سرنڈر کرلیا، اعتراف کرلیا، ......(میزبان کے مطالبے کہ: ''آپ آئندہ ہمارے ساتھ کھڑے ہوں'' کے جواب میں:) میں کھڑا ہوں، آپ کے ساتھ کھڑا ہوں۔ مالک بھائی! میں بندۂ ناچیز ہوں، خطا کا پتلا ہوں، مجھ سے خطا ہوئی، میں بالکل اعتراف کرتا ہوں۔''

مقامِ عبرت یہ ہے کہ کچھ ہی عرصہ قبل اِنھی مولانا طارق جمیل صاحب نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں ایسے کلمات کہہ دیئے جو کسی بھی طرح ایک نبی کے شایانِ شان نہیں، بلکہ بہر صورت بے ادبی و گستاخی کے زمرے میں ہی آتے ہیں۔ اُن کلمات کا خلاصہ دو جملے ہیں:۔ ا: سزا کے طور پر گدھے پر بٹھا کر بازار میں چکر لگوایا گیا۔ ۲: چہرہ مبارک سیاہ کیا گیا۔ (نعوذ باللہ من ذلک)

مولانا کے اِس بیان پر تنقید ہوئی اور اُن سے معافی کا مطالبہ کیا گیا۔ لیکن چونکہ یہ مطالبہ میڈیا جیسے مافیا کی طرف سے نہیں تھا، بلکہ علماء اور دین دار طبقہ کی طرف سے تھا، جن کی مولانا طارق جمیل کے ہاں کوئی اہمیت و وقعت نہیں ہے۔ اِس لیے مولانا اپنی غلط بات بلکہ (جھوٹ پر) ڈٹ گئے اور ایک عظیم الشان پیغمبر کے احترام میں معذرت، معافی، سرنڈر کے بجائے اپنی ''ناک'' اونچی کرنے کی کوشش میں جت گئے۔ بڑی تگ و دَو اور کوشش کے بعد مولانا کو ''تفسیر قرطبی'' سے ایک موضوع اور من گھڑت روایت دستیاب ہوگئی جس میں ایک جملے کا تذکرہ تھا، دوسرے جملے کی بات اُس میں بھی نہیں تھی۔ مولانا طارق جمیل صاحب نے ایک پیغمبر کی ناموس کا لحاظ کرتے ہوئے کھلے دل سے معافی مانگنے کے بجائے ایک جملہ کہہ کر دامن جھاڑ لیا کہ: ''مجھ سے سہو ہوگیا۔'' اور ''سہو'' کا اقرار بھی کسی مجمع عام میں نہیں بلکہ کسی ایک آدمی کے سامنے فون پر کیا۔

کس قدر مقامِ عبرت ہے کہ: ساری دنیا کو اَخلاق، عاجزی، جھک جانے، غلطی کا اعتراف کرنے، اور زیادتی ہو جانے پر بلا تامل معافی مانگنے کا درس دینے والا مبلغ خود اِس قدر اخلاقی پستی کا شکار ہے کہ: میڈیا کے حوالے سے بولے گئے ''سچ'' پر تو ایک ایک کو فون کر کے معافیاں مانگ رہا ہے اور سرنڈر، سرنڈر کی تسبیح پڑھ رہا ہے، اور ایک پیغمبر کے حوالے سے بولے گئے ''جھوٹ'' کا سرعام اقرار کرنے اور معافی مانگنے کے لیے بھی تیار نہیں!؟

☆☆☆☆

مولانا زبیر احمد صدیقی

کرونا وائرس وبا......اسباب، سدباب، طریق علاج

جنوری ۲۰۲۰ء سے چائنا کے شہر ''ووہان'' سے پھیلنے والی وبائی مہلک مرض ''کرونا وائرس'' آفت بن کر دنیا میں پھیل چکی ہے، اس متعدی بیماری کی وجہ سے ہلاکتوں میں دن بہ دن نہ صرف اضافہ ہوتا جا رہا ہے، بلکہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ بیماری شہروں اور ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لیتی جا رہی ہے۔ بڑھتی ہوئی اس بیماری کے علاج کے لیے دنیا، بالخصوص پاکستان کے پاس، اس وبا میں مبتلا لوگوں کے لیے ہسپتال، ادویات اور ساز وسامان کی قلت ہے۔ چائنا کے بعد اس وبا سے سب سے زیادہ اٹلی متاثر ہوا ہے، جہاں روزانہ سینکڑوں ہلاکتیں ہو رہی ہیں، حکمران اس ہلاکت خیز وبا کے سامنے اپنی بے بسی کا اظہار کر رہے ہیں۔ ایران، فرانس، جرمنی، ہانک کانگ سمیت ۱۶۶/ممالک اس مرض کے حملوں کا شکار ہیں۔

۲۳/جنوری ۲۰۲۰ء میں اس وبا کی چائنا میں دریافت ہوئی اور ۷/مارچ ۲۰۲۰ء تک صرف ۴۴/روز میں، دنیا میں ایک لاکھ مریض رجسٹرڈ ہوئے۔ آج بوقت تحریر مؤرخہ ۲۲/مارچ تک تین لاکھ سے زائد مریض دنیا بھر میں رجسٹرڈ ہو چکے ہیں۔ مضمون قارئین تک پہنچنے کے وقت تک نہ جانے کتنے مریض بن چکے ہوں گے۔ دنیا بھر میں اس مرض کی وجہ سے اس قلیل عرصہ میں پندرہ ہزار سے زائد افراد لقمۂ اجل بن چکے ہیں۔ پاکستان میں مؤرخہ ۲۶/فروری کو ایران سے آنے والے زائرین میں پہلا کیس رجسٹرڈ ہوا، ان زائرین اور ان سے متاثر دیگر افراد کی وجہ سے تادم تحریر پانچ ہزار چھ سو پچاس مشتبہ مریض، جبکہ آٹھ سو تین تشخیص شدہ مریض بن چکے ہیں، اب تک پاکستان میں اس مرض کی وجہ سے تین اموات بھی ہو چکی ہیں۔ جس تیزی کے ساتھ یہ وبا پھیل رہی ہے، خطرہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ بروقت اقدامات نہ ہونے کی صورت میں یہ وبا ملک بھر، بلکہ دنیا بھر کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

دنیا بھر کی طرح پاکستان نے بھی اس مرض سے نبرد آزما ہونے کے کے لیے اقدامات اٹھائے ہیں، جن میں تعلیمی اداروں کی بندش، مدارس اور عصری تعلیمی امتحانوں کی منسوخی، اجتماعات پر پابندی، دفعہ ۱۴۴/کا نفاذ، سندھ بھر میں لاک ڈاؤن، دوسرے صوبوں میں کاروباری مراکز، شادی ہالز، ہوائی جہازوں، بسوں، موٹروں، ٹرینوں وغیرہ کی بندش، گھر میں رہنے کے احکامات، مختلف حفاظتی تدابیر وغیرہ شامل ہیں، دیگر ممالک میں احتیاطی نقطۂ نظر سے مساجد، حتیٰ کہ حرمین شریفین بند کر دیے گئے ہیں، جو بلاشبہ اہل ایمان اور دردمند مسلمانوں کے لیے اذیت ناک ہے۔

بعض لوگ کرونا وائرس وبا کا موجد امریکا کو قرار دے کر، اسے چائنا اور اس کے اتحادی ممالک کے خلاف معاشی جنگ قرار دے رہے ہیں، تاہم سبب کوئی بھی ہو، بلاشبہ اب یہ ایک عالمی وبا بن چکی ہے، جسے اقوام متحدہ نے بھی عالمی وبا قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی وجہ سے دنیا بھر میں خوف وہراس کی فضا قائم ہے، ممکن ہے اس مرض سے کچھ ممالک اپنے سیاسی ومعاشی فوائد بھی حاصل کر رہے ہوں، تاہم اس وبا کو سنجیدگی کے ساتھ لینے کی ضرورت ہے۔

وبا اور امراض کے متعدد اسباب ہوتے ہیں، ظاہری اسباب تو علم ظاہر رکھنے والے حضرات یعنی ڈاکٹر، انجینئر وغیرہ بتاتے ہیں، جبکہ باطنی، حقیقی اور اصل اسباب وحی کی تعلیمات بتاتی ہیں، جو آسمانوں سے نازل ہوتی ہے، ذیل میں ایسے امراض کے باطنی اسباب کا قرآن وسنت سے جائزہ لیا جا رہا ہے۔

۱)......اعلانیہ فحاشی:

سیدنا عبداللہ بن عمرؓ ارشاد فرماتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت مہاجرین کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا: لم تظهر الفاحشة في قوم حتى يعلنوا بها الا فشا فيهم الطاعون والاوجاع التي لم تكن مضت في اسلافهم الذين مضوا (ابن ماجہ) جس قوم میں علانیہ فحش کاری کا بازار گرم ہو جائے اس میں طاعون اور ایسی بیماریاں عام ہو جائیں گی جو اس سے پہلے ان کے گذشتہ آباء واجداد میں کبھی نہیں تھیں۔

یاد رہے کہ طاعون بھی وبائی مرض ہے، جو تیزی سے پھیلتا ہے، اور ماضی میں عہد خلفائے راشدین سے لے کر انگریز کے دور تک متعدد بار یہ وبائی مرض ظاہر ہو کر لاکھوں لوگوں کو لقمہء اجل بنا چکا ہے، حدیث مبارک میں، طاعون کو امم سابقہ کے لیے عذاب الٰہی قرار دیا گیا ہے، بنی اسرائیل میں متعدد بار اس وبا سے ستر ہزار، ایک لاکھ تک لوگ بوجہ فحاشی وعریانی ودیگر معاصی ہلاک ہوئے [بخاری] البتہ یہ طاعون اور اس جیسے امراض کفار کے لیے عذاب اور مقربین کے لیے باعث درجات ہوتے ہیں، اس لیے طاعون میں فوت ہو جانے والے شخص کو شہید قرار دیا گیا ہے، ایک حدیث میں ہے: الطاعون شهادة لامتي ورحمة لمسلم. [مسند احمد] طاعون میری امت کے لیے شہادت اور رحمت ہے۔

سنت اللہ یہ ہے کہ جب عذاب خداوندی اترتا ہے، تو وہ کفار وفساق کی وجہ سے اترتا ہے، لیکن اس میں نیک وبد، مسلم وکافر بھی مبتلا ہوتے ہیں، البتہ آخرت میں تفریق کر کے مقربین اور نیکوکاروں کو درجات عالیہ نصیب ہوں گے، معجم طبرانی میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ’’طاعون میں صبر کرنے والا ایسے ہے، جیسے: میدان جہاد میں جمنے والا اور طاعون سے بھاگنے والا ایسے ہے، جیسے: میدان جنگ سے بھاگنے والا (گناہ گار ہوتا ہے)۔

حاصل یہ ہے کہ اعلانیہ فحاشی و عریانی کے سبب سے ایسی وبائیں اور امراض مسلط کیے جاتے ہیں، جو اثر کے لحاظ سے صرف کفار تک محدود نہیں رہتے، بلکہ ہر انسان، خواہ مسلم ہو یا کافر، نیک ہو یا بد، ان پر طبعی لحاظ سے اثر انداز ہوتے ہیں۔

۲)......**کثرتِ زنا**:

معاشرے میں جب بدکاری و زنا کی کثرت ہو جائے، تو کثرت اموات کی شکل میں عذاب بھیجا جاتا ہے، چنانچہ مؤطا امام مالک کی ایک روایت میں ہے: "ولافشا الزنا فی قوم قط الا کثرفیهم الموت" جس قوم میں زنا عام ہو جائے، اس قوم میں اموات زیادہ ہو جاتی ہیں۔

ام المؤمنین سیدہ میمونہؓ کی روایت ہے، انہوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں سنا: "لاتزال امتی بخیر مالم یفشی فیهم ولدالزنا، فاذافشافیهم ولدالزنافاو شك ان یعمهم الله بعذاب" [مسند احمد] میری امت اس وقت تک خیر پر رہے گی، جب تک ان میں اولاد زنا عام نہیں ہو جائے گی۔ جب ان میں ناجائز اولادیں عام ہو جائیں گی، تو اللہ تعالی ان پر عام عذاب بھیج دے گا"۔

اسی طرح کی ایک حدیث معجم طبرانی میں بھی موجود ہے۔

واضح رہے کہ تیزی سے پھیلتی یہ وبا اور کثرت سے ہوتی اموات بھی اس پیشین گوئی کا مصداق محسوس ہوتی ہیں، بے راہ روی اور بغیر نکاح کے مرد و زن کا برسہا برس سے اختلاط دنیا میں اتنا عام ہے کہ کسی سے مخفی نہیں، کوئی بعید نہیں کہ موجودہ حالات اس بے راہ روی کا نتیجہ ہوں۔

حق تعالی کی نافرمانی:

قرآن کریم کی تصریحات کے مطابق آنے والی ہر آفت و مصیبت انسانی اعمال بد اور بداعتقادی کا نتیجہ ہوتی ہے، انسانوں کی سرکشی اور معاصی کی کثرت، اللہ تعالی کے عذاب کا موجب ہوا کرتی ہے، چنانچہ سورہء اعراف میں مذکور ہے: فَلَمَّا عَتَوْا عَن مَّا نُهُوا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ (الاعراف: ۱۶۶) چنانچہ ہوا یہ کہ جس کام سے انہیں روکا گیا تھا، جب انہوں نے اس کے خلاف سرکشی کی تو ہم نے ان سے کہا: جاؤ، ذلیل بندر بن جاؤ"۔

سورہء زخرف میں ہے: فَلَمَّا آسَفُونَا انتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ أَجْمَعِينَ (الزخرف: ۵۵) چنانچہ جب انہوں نے ہمیں ناراض کر دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان سب کو غرق کر دیا"۔

معلوم ہوا کہ عذاب الہی انتقام خداوندی ہوتا ہے اور انتقام تب لیا جاتا ہے، جب لوگ اللہ تعالی کی نافرمانیاں کرتے ہیں۔ امم سابقہ میں بندر و خنزیر کی شکل میں تبدیل ہو جانا سرکشی کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالی نے اپنی نافرمانیوں پر عذاب کے اترنے کو لوگوں کی جانب سے اپنے آپ پر ظلم قرار دیا ہے۔

وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (النحل:۱۱۸)اور ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا، بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے“۔

سورہ شوری میں اس مضمون کو مزید تفصیل سے یوں بیان فرمایا:”وَمَا أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ“ (الشوری ۳۰)اور تمہیں جو کوئی مصیبت پہنچتی ہے، وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کیے ہوئے کاموں کی وجہ سے پہنچتی ہے، اور بہت سے کاموں سے تو وہ درگزر ہی کرتا ہے“۔

واضح رہے کہ آیات واحادیث میں مذکور آفات، بلایا اور وباؤں کے باطنی اسباب بیان کیے گئے ہیں، یہ اسباب آسمانی علم اور وحی سے ہی معلوم کیے جاسکتے ہیں، جبکہ ظاہری اسباب آنکھوں سے نظر آتے ہیں، یہ اسباب ڈاکٹر اور ماہرین بتایا کرتے ہیں، دونوں اسباب میں کوئی تعارض یا منافات نہیں، جب باطنی اسباب پیدا ہوتے ہیں تو کسی وجہ سے ظاہری اسباب بھی پیدا ہو جاتے ہیں، اس لیے کسی قسم کے شک وشبہ میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔

سدباب:

کرونا وائرس اور اس جیسے امراض کے سدباب کے لیے، ماہرین کی جانب سے بتائی گئی احتیاطی تدابیر، دائرہ شریعت میں رہ کر اختیار کرنا بلاشبہ جائز ہے، نہ صرف جائز بلکہ بعض اوقات تدابیر ضروری ہو جاتی ہیں۔ ایسی تدابیر نہ توکل کے خلاف ہیں اور نہ ہی سنت مطہرہ اور شریعت کے، بلکہ شریعت کے عین مطابق ہیں۔ ہم ذیل میں ایسی تدابیر اور حفاظتی اسباب کا شریعت مطہرہ کی روشنی میں جائزہ لے رہے ہیں:

۱)......ماہرین کے بقول کرونا وائرس متعدی مرض ہے، جو ایک سے دوسرے کو جلد منتقل ہو جاتا ہے اور عموماً اس کا تعدیہ ہاتھ ملانے اور ہاتھ سے منہ، ناک، آنکھ کے راستے سے منتقل ہونے سے ہوتا ہے، اسی طرح کسی مبتلائے وبا کے، دوسرے کے سامنے کھانسنے، چھینکنے سے بھی یہ وبا مذکورہ اعضا کے منافذ کے ذریعے جسم میں چلی جاتی ہے۔

بعض لوگ بخاری شریف کی روایت ”لاعدوی، ولاطیرۃ، ولاھامۃ ولاصفر“ (بیماری متعدی ہونے کا نظریہ، بدشگونی، ھامہ اور صفر سے متعلق عقیدہ اسلام میں نہیں ہے) کی بنیاد پر یہ کہہ دیتے ہیں کہ بیماری ایک سے دوسرے کو منتقل نہیں ہوتی، اس لیے وبائی امراض سے محتاط رہنے اور دوسروں سے الگ رہنے کو خلاف اسلام سمجھنے کا تاثر پایا جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ تاثر حدیث کے مفہوم ومطلب سے ناواقفیت کی وجہ سے ہے۔ اہل علم نے اس حدیث کے ساتھ دیگر مندرجہ ذیل احادیث کو پیش نظر رکھا ہے اور دونوں قسم کی احادیث میں تطبیق پیش کی ہے، جن کی روشنی میں حدیث مذکورہ بالا کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے:

(۱) جناب رسول اللہ ﷺ نے اسی حدیث کے آخر میں یہ جملہ بھی ارشاد فرمایا: وفر من المجذوم

کماتفرمن الاسد“[بخاری] جذام کے مرض رکھنے والے سے ایسے بھاگو جیسے تم شیر سے بھاگتے ہو۔

(۲) صحیح مسلم میں عمرو بن شرید ثقفی کی روایت میں ہے کہ بنو ثقیف کا وفد، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اس میں ایک شخص جذام (کوڑھ) کے مرض میں مبتلا تھا، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست حق پرست پر بیعت کرنا چاہتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پیغام بھیجا، ہم نے آپ کو (زبانی) بیعت کرلیا ہے آپ واپس چلے جائیں۔[فتح الباری]

(۳) امام طبریؒ نے امام زہریؒ کی سند سے روایت کیا ہے کہ سیدنا عمرؓ نے معیقیب سے فرمایا تھا کہ: مجھ سے ایک نیزہ کی مسافت پر بیٹھو۔ ایک روایت میں ہے کہ سیدنا عمرؓ کا یہی معمول تھا۔[فتح الباری]

(۴) سنن ابن ماجہ میں ہے: جذام کے مرض والے کو مسلسل نہ دیکھو۔[ابن ماجہ]

(۵) سیدنا عبداللہ ابن ابی اوفیؓ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، مجذوم سے دو نیزوں کی مسافت سے گفتگو کیا کرو۔[فتح الباری]

(۶) طاعون زدہ علاقے کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم کسی زمین میں طاعون کے بارے میں سنو تو اس میں نہ جاؤ اور وہاں سے لوگ باہر نہ آئیں۔[بخاری]

(۷) لا یوردن ممرض علی مصحح. بیمار اونٹ کو تندرست اونٹ کے پاس نہ لایا جائے۔
[مسلم]

(۸) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے خارشی اونٹ لایا گیا، آپ نے اسے دوسرے اونٹوں سے الگ باندھنے کا حکم فرمایا۔

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کی بیماری دوسرے تک متعدی ہو سکتی ہے، اس لیے اہل علم نے ”لا عدویٰ“ والی حدیث کے متعدد مطالب بیان کیے ہیں، جن میں سے ایک راجح مطلب ہدیہ قارئین ہے:

ابن الصلاح اور امام بیہقیؒ فرماتے ہیں: جن احادیث میں امراض کے تعدیہ کی نفی ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ امراض میں بالذات یعنی از خود یہ تاثیر نہیں ہوتی کہ دوسرے شخص کو لگ جائیں، البتہ اللہ تعالی کے حکم سے دوسرے کو لگ سکتے ہیں۔ دراصل آپ صلی اللہ علیہ وسلم زمانہ جاہلیت میں پائے جانے والے غلط نظریہ کی نفی اور توحید کا اثبات فرمانا چاہتے ہیں، زمانہ جاہلیت میں بیماری کو مؤثر حقیقی سمجھا جاتا، نہ کہ اللہ تعالی کو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ بیماری از خود دوسرے کو نہیں لگتی، بلکہ اللہ تعالی کے حکم سے لگتی ہے۔ (زمانہ جاہلیت کا ایک تصور تو یہ تھا کہ بیماری ”از خود“ لگتی ہے، اور دوسرا غلط تصور یہ تھا کہ: چھوت چھات سے بیماری ”ضرور“ لگتی ہے۔ یہ دونوں تصور غلط ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ ایک سے دوسرے کو بیماری لگنا کوئی

ضروری نہیں۔ اور جب بیماری لگتی ہے، اللہ کے حکم سے لگتی ہے، از خود نہیں لگ سکتی۔[مدیر])

بعض لوگ مصافحہ سے پرہیز کو معیوب سمجھتے ہیں، حالانکہ آپ ﷺ نے مجذوم سے مصافحہ نہیں فرمایا، نیز خارشی اونٹ کو دوسرے اونٹوں سے الگ باندھنے اور دوسرے سے گفتگو کے وقت دو نیزوں کا فاصلہ رکھنے کی ہدایت فرمائی۔ (لیکن ایک حدیث میں ہے کہ: آپ ؐ نے دعائے توکل پڑھ کر جذام والے کے ساتھ بیٹھ کر کھانا تناول فرمایا۔ اِس لیے حفاظتی دعا پڑھ کر مصافحہ کرنے میں حرج بھی نہیں ہے۔[1] [مدیر])

کچھ لوگ ان سب ہدایات کو خلاف توکل قرار دیتے ہیں، یہ نظریہ بھی بے بنیاد ہے، اس لیے کہ اہل علم کے نزدیک وہ توکل جو حضرات انبیاء علیہم السلام نے اختیار کیا وہ توکل بالاسباب تھا، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ متوکل کس کی ذات ہوگی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر جہاد بھی فرمایا اور ساتھ ہجرت اور دعا بھی۔ آپ نے اکثر نہ صرف اسباب کا اہتمام کیا، بلکہ پوری حکمت عملی اختیار فرمائی۔ لہٰذا اسباب اور احتیاطی تدابیر اختیار کرکے، اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا اور توکل کرنا ہی اصل توکل ہے۔

(دعاؤں کا اہتمام کرلینا بھی توکل کی ایک قسم ہے۔ نبی کریم ﷺ نے دعا پڑھ کر ہی جذامی کے ساتھ کھانا تناول فرمایا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ دو انتہائیں ہیں، ایک طرف یہ تصور کہ: ایک سے دوسرے کو بیماری لگ ہی نہیں سکتی، خواہ خدا بھی چاہے۔ (نعوذ باللہ) لہٰذا اِحتیاطی تدابیر اختیار کرنا غلط ہے۔ اور دوسری طرف یہ تصور کہ میل ملاپ سے بیماری ضرور لگتی ہے، خدا چاہے یا نہ چاہے۔[نعوذ باللہ] اِس لیے میل ملاپ سے بچنا گویا فرض کے درجے میں ہے۔ یہ دونوں ہی تصور غلط اور خلافِ اسلام ہیں۔ اسلام کا

---

[1] قال ملا علی القاریؒ: ”وقد عمل النبی ﷺ بالأمرین لیشیر إلی الجوابین عن قضیة الحدیث، فإنه جاءه مجذوم، فأكل معه قائلا: بسم الله ثقة بالله وتوكلا علیه. وجاءه مجذوم آخر لیبایعه، فلم یمد إلیه یده وقال: قد بایعت. فأولا نظر إلی المسبب و ثانیا نظر إلی السبب فی مقام الفرق وبین أن كلا من المقامین حق، نعم! الأفضل لمن غلب علیه التوكل أو وصل إلی مقام الجمع هو الأول، والثانی لغیره.“

[مرقاة المفاتیح، ح:۴۲۷۰]

”قال الأردبیلی: قال البیهقی: أخذه صلی الله علیه وسلم بید المجذوم و وضعها فی القصعة وأكله معه فی حق من یكون حاله الصبر علی المكروه، وترك الاختیار فی موارد القضاء. وقوله ﷺ ”فر من المجذوم كما تفر من الأسد؛“ و أمره ﷺ فی مجذوم بنی ثقیف بالرجوع فی حق من یخاف علی نفسه العجز عن احتمال المكروه والصبر علیه فیحرز بما هو جائز فی الشرع.“

[تحفة الأحوذی:۴۳۸/۵]

اعتدال والا تصور یہ ہے کہ: عقیدہ درست رکھتے ہوئے اپنے دِل کی تسلی کے لیے میل ملاپ سے بچنا بھی درست ہے۔اور دعائے توکل پڑھ کر خدا پر بھروسہ رکھتے ہوئے میل ملاپ رکھنا بھی درست ہے۔[مدیر])

علاج:

تا حال کرونا وائرس کے لیے نہ کوئی حفاظتی ویکسین ایجاد ہوئی ہے، نہ ہی مستقل دوائی، البتہ ایسے متاثرین کا علاج اور غیر متاثرین کی حفاظت تنہائی اختیار کرنے اور عدم اختلاط کو قرار دیا جارہا ہے، نیز ملیریا وغیرہ کی ادویات استعمال کی جارہی ہیں، بعض مبتلائے مرض لوگ جو تندرست ہو گئے ہیں، اپنے اپنے تجربے بھی دوسروں تک پہنچارہے ہیں، اگر دوائی میسر بھی ہوئی، تب بھی ایسی وباء میں روحانی علاج، رجوع الی اللہ، توبہ واستغفار کی شدید احتیاج تھی، اب تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ، ایسے امراض سے بچاؤ اور علاج کے لیے اسباب، احتیاطی تدابیر، اختیار کرنے کے ساتھ رجوع الی اللہ کیا جائے، اس لیے پوری امت کا فریضہ ہے کہ اس برے وقت میں درج ذیل امور کو شفاء کی نیت سے ضرور سرانجام دیں۔

۱)......انفرادی، اجتماعی صغیرہ کبیرہ گناہوں سے گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ کے حضور معافی طلب کی جائے اور توبہ کی جائے، توبہ کا اہم عنصر گناہ پر ندامت اور گناہ ترک کرنا ہے، اس لیے پوری فکر وسوچ کے ساتھ، گناہ ذہن میں رکھ کر انہیں ترک کرنے کے عزم کے ساتھ، گزشتہ گناہوں کی اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کی جائے۔

۲)......توبہ کے ساتھ کثرت استغفار بھی کیا جائے، استغفار میں یہ تاثیر ہے کہ کافر بھی استغفار کرے تو عذاب رک جاتا ہے اور مؤمنین کے لیے مشکلات سے نجات اور آسانیوں کا بہترین آزمودہ نسخہ ہے۔

۳)......اپنی معاشیات سے حرام کو نکال کر حلال اختیار کیا جائے، سود جیسے مہلک اور خطرناک مرض سے توبہ کی جائے اور لوگوں کو سہولتیں پہنچائی جائیں، زنا، فحاشی وعریانی سے بھی مکمل اجتناب کیا جائے، اور اس گناہ کو بالکل ترک کر دیا جائے۔

۴)......قرآن کریم شفاء ہے، زیادہ سے زیادہ تلاوت قرآن کریم کا اہتمام کیا جائے۔

۵)......فرائض، بالخصوص نمازوں کی پابندی کی جائے۔

۶)......حفاظت کے ماثور ومنقول اوراد وادعیہ کا بطور خاص اہتمام ہو، خاص طور پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صبح وشام کی جو دعائیں منقول ہیں، جن سے آدمی جملہ خطرات وآفات سے محفوظ رہتا ہے، کا التزام کیا جائے۔

۷)......ممکن ہو تو زمزم مشروبات میں شامل کیا جائے، زمزم کا شفا ہونا بدیہی عمل ہے۔

۸)......صدقہ وخیرات کا معمول بنایا جائے، بلاشبہ صدقات سے بلائیں اور آفتیں ٹل جاتی ہیں، اللہ تعالیٰ کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔



سعود عثمانی

دانش وری کا عذاب

حضور دانش مند صاحب! پھر آپ ہی بتا دیں کہ عذاب کیا ہوتا ہے؟ ہوتا بھی ہے کہ نہیں؟ اس نام کی کوئی چڑیا' کبھی تاریخ میں پائی جاتی بھی ہے یا بس کہانیاں ہیں؟ یہ جو صحائف میں فرمایا گیا ہے کہ فلاں شخص پر اللہ کا عذاب آیا' فلاں قوم کی اللہ نے پکڑ کی' فلاں بستی پر عذاب نازل ہوا' تو یہ عذاب کیا ہوتا ہے؟ کوئی عذاب کبھی تھا بھی کہ نہیں تھا؟ اگر تھا تو اس کی کیا نشانیاں ہوتی ہیں؟ یہ اسباب کے ساتھ ہوتا ہے یا بلاسبب؟ اس کی کوئی زمینی واقعاتی توجیہہ ہوتی ہے یا بلا توجیہہ کے نازل ہوا کرتا ہے؟ ہم تو سمجھ نہیں پائے۔ ہم کیا پوری قوم کیا' پوری ملت سمجھ نہیں پائی آج تک۔ اب' آپ کی افسرانہ گریڈ کی دانش وری سے درخواست ہے کہ کچھ تفصیل بتائیں' اگر آپ حاضر سروس افسر دانشور ہیں تو سبحان اللہ! ہم آپ کی ہر بات درست مانتے ہیں' اگر ریٹائرڈ بیوروکریٹ ہیں تو اس سے زیادہ عقلمندی کا تصور بھی محال ہے' اگر معروف ٹی وی اینکر ہیں تو آپ کے عقل کل ہونے میں کیا شبہ ہے اور اگر وزیر ہیں تو مستند ہے آپ کا فرمایا ہوا۔ کچھ بتائیں کہ ساری ملت اسلامیہ آپ کے اظہارِ حق کی منتظر ہے۔

سوال کورونا سے شروع ہوا تھا۔ کچھ عالموں نے کہہ دیا تھا کہ یہ وبا گناہوں اور بداعمالیوں کی وجہ سے انسانوں پر ایک عذاب ہو سکتی ہے۔ اس لیے اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے' چونکہ آپ عقل و دانش کے پیکر ہیں' اس لیے آپ کا فرض تھا کہ اس بے سروپا بات کی تردید کریں۔ صرف تردید ہی نہیں کریں' بلکہ کہنے والوں کی وضع قطع اور حلیے پر بھی پرحقارت لہجے میں تبصرہ کریں' جیسا کہ بڑے آدمی کا حق ہے۔ آپ کا جواب بہت حقیقت پسندانہ اور بہت ماہرانہ تھا۔ مجھے یہ جواب بہت اچھا لگا' اس لیے اجازت دیں کہ اس کو اپنے الفاظ میں بیان کردوں اور وہ یہ کہ: وبائیں دنیا میں آتی جاتی رہی ہیں۔ طاعون' ہیضہ' چیچک سب تاریخی حقیقتیں ہیں اور ان کا کسی عذاب سے کوئی تعلق نہیں۔ سائنس سب کی وجوہات بھی بیان کر چکی ہے اور دوائیں بھی ایجاد کر چکی ہے۔ کوئی وبا سانس کے ذریعے پھیلتی ہے' کوئی رطوبت کے ننھے قطروں سے' کوئی جانوروں سے' کوئی چوہوں سے۔ سب معلوم ہے' تو ان کا اللہ کے عذاب سے کیا تعلق؟

اور جو زلزلے ہیں' یہ زمینی پلیٹوں کے ملنے سے آتے ہیں یا آتش فشاں کے پھٹنے سے' یا لاوے کے زمین پھاڑ کر نکلنے سے۔ کچھ علاقے ان پلیٹوں کے سنگم پر واقع ہیں اس لیے زیادہ زد میں آتے ہیں؟ کوئی بستی اگر اس کی زد میں آ گئی تو اس کے مادی اسباب ہیں۔ کوئی پلیٹ ہلی ہوگی۔ زیر زمین **magma** نے

حرکت کی ہوگی۔ زلزلہ ویسے ہی نہیں آ گیا ہوگا۔ کچھ اسباب ہوں گے۔

اور یہ جو طوفان ہیں۔ سائیکلون' ہریکین' ٹورناڈو وغیرہ وغیرہ۔ ان سب کے اسباب ہیں۔ ہوا کی گردش' کم دباؤ۔ بہت سے عوامل ہیں' جو ان طوفانوں کو جنم دے دیتے ہیں۔ کوئی شہر' کوئی بستی اس کی زد میں آجائے تو پھر تباہی تو مچتی ہے' لیکن یہ سب اسباب ہیں۔ ان کا عذاب سے کیا تعلق؟

اور یہ جو سیلاب ہیں۔ زمین کاٹ کر لے جاتے' شہر اجاڑتے۔ یہ جو بارشیں ہیں' حد سے زیادہ۔ گھر گراتیں' سڑکیں نہروں میں اور میدان دریاؤں میں تبدیل کرتیں۔ دریاؤں کو کناروں سے باہر نکالتیں۔ یہ سب اسباب کے تحت ہوتی ہیں۔ ماہرین سب کی وجوہات بتاتے رہتے ہیں۔ کوئی ایک بھی بے سبب نہیں۔ انہیں عذاب سے تعبیر کرنا محض جہالت اور کم علمی ہے۔ یہ تو ہمیشہ سے دنیا میں ہوتی ہی آئی ہیں۔ سب بیکار باتیں ہیں۔

اور یہ جو خشک سالی ہے۔ بارشیں نہ ہونا' یا بہت کم ہونا۔ ندی نالے دریا خشک ہو جانا' پیاس کے سبب فصلیں تباہ ہو جانا۔ اناج بہت کم اُگنا' قحط پڑ جانا' یہ بھی فطری ہیں' ان کے بھی اسباب ہیں۔ ذرا پوچھئے ماہرین موسمیات سے؛ وہ بتا دیں گے کہ اس سال فلاں ملک' فلاں علاقے میں جو بارشیں کم ہوئیں۔ ان کی وجوہات کیا تھیں؟ ارے وہ تو یہ بھی اندازہ بتا دیتے ہیں کہ اگلے سال فلاں علاقے میں کتنی کم یا کتنی زیادہ بارشیں ہوں گی؟ اناج کی کمی' قحط کی پریشانی میں اس ماہرانہ رائے سے فرق پڑے نہ پڑے' لیکن ان کا عذاب سے کیا تعلق؟ زمینی حقائق ہیں۔ کام کریں' دعا کا فائدہ؟

اور یہ پھل زیادہ یا کم لگنا۔ فصل اچھی یا بری ہونا۔ خوش حالی سے تو اس کا تعلق یقیناً ہے۔ عذاب سے اس کا کیا تعلق کہ لوگ آسمان کی طرف منہ اٹھا کر ہاتھ اٹھا لیتے ہیں۔ پانی ٹھیک لگے۔ کھاد مناسب ملے۔ ماہرین زراعت کی ہدایات پر عمل رہے تو کام ٹھیک ہوگا' اگر پھر بھی ٹھیک نہ ہو تو مزید وجہ ڈھونڈنی چاہیے۔ وہ مل جائے تو اگلی وجہ۔ اس کے بعد اس سے اگلی۔

اور یہ جو عام بیماریاں ہیں' جن میں انسان مبتلا ہوتا ہے۔ تکلیف اٹھاتا ہے' فریاد کرتا ہے' بلبلاتا ہے۔ ہر ایک کی سائنسی وجہ ہے۔ ڈاکٹرز سے پوچھ لیں' وہ بتا دیں گے کہ ہر عضو کا کام کیا ہے اور وہ خراب کیسے ہوتا ہے۔ دوائی لینی چاہیئے' علاج کرنا چاہیے۔ خواہ مخواہ غیر مادی اسباب تلاش کرنے کا فائدہ؟ اور اسے عذاب سے تعبیر کرنا تو بھئی سراسر جہالت ہے۔

حضور دانش مند صاحب! دِل میں اُتر گئیں آپ کی باتیں اور نصیحتیں۔ سائنسی ذہن ہو' علت و معلول کو سمجھتا ہو۔ اسباب و نتائج پر نظر ہو' تاریخ دان' سائنس دان' جغرافیہ دان غرض ہمہ دان ہو' تو آپ جیسا دماغ وجود میں آتا ہے۔ یہ باتیں تو اچھی طرح سمجھ میں آگئیں' لیکن یہ سمجھ نہیں آیا کہ پھر عذاب کیا ہوتا

ہے؟ ہوتا بھی ہے کہ نہیں؟ یا بس باتیں ہی بنی ہوئی ہیں؟

وہ جو طوفان تھا' جو حضرت نوحؑ کی قوم پر آیا تھا۔ آسمان سے پانی اور تنور سے پانی اُبلنا شروع ہو گیا تھا۔ محکمہ موسمیات والے تب نہیں ہوتے تھے' لیکن بارشیں تو ہوتی تھیں؟ ان کی بھی تو وہی سائنسی وجوہات ہوں گی' جو آج ہیں۔ اسے ہم عذاب سمجھیں یا نہ سمجھیں' قرآن کریم اور حدیث کے کہنے کے باوجود!

اور وہ جو قوم اِرَم سائنسی اُصولوں پر بند بناتی تھی۔ ہریالی' فصلوں' میووں میں کھیلتی پھرتی تھی اور ایک دم بند ٹوٹ گیا تھا اور زمینیں بنجر ہو کر رہ گئی تھیں۔ جہاں بعد میں صرف کڑوے پھل اگتے تھے۔ سنا ہے بڑے بڑے چوہوں نے ان کا بند کتر ڈالا تھا۔ تو یہی سبب ہوگا' بند ٹوٹنے کا؟ پھر اسے عذاب کہیں یا نہ کہیں؟ اللہ تعالیٰ تو کہہ رہے ہیں۔ ہم کہیں' یا نہ کہیں؟

اور وہ جو قوم عاد تھی' بڑی زور آور' بڑی جسیم۔ وہ لوگ جو کہتے تھے کہ ہم سے زیادہ طاقت ور کون ہے؟ جسے ہوا نے ہلاک کر دیا تھا' وہ ہوا جو ان پر سات راتیں آٹھ دن مسلسل چلتی رہی تھی۔ جب رکی تو وہ ایسے پڑے تھے' جیسے کھجور کے تنے گرے ہوتے ہیں۔ وہ ہوا اور ریت کا طوفان بھی تو بظاہر کم دباؤ اور دیگر تغیرات کی سائنسی وجوہات کی بنا پر بنا ہوگا نا؟ تو اسے نہ ٹلنے والا عذاب مانیں یا نہ مانیں؟

اور وہ جو قوم ثمود تھی۔ پہاڑ تراشنے والی' جسے ایک چنگھاڑ نے آ پکڑا تھا اور جو اپنے مسکنوں ہی میں ڈھے گئے تھے۔ وہ چنگھاڑ کسی زلزلے کی ہوگی۔ یا بجلی کی۔ یا کسی اور چیز کی۔ کیا اس کے کچھ اسباب رہے ہوں گے؟ کیا کہتے ہیں؟۔ کیا اسے عذاب کہہ لیں؟ وہ عذاب' جس سے کہیں پناہ نہیں ملتی؟

اور وہ جو قوم فرعون تھی' جس پر کبھی طوفان آتا تھا' کبھی ٹڈی دل حملہ آور ہوتا' کبھی جوؤں کی بہتات ہو جاتی تھی' کبھی لاتعداد مینڈک ہر طرف پھدکنے لگتے تھے۔ کبھی پانی کا رنگ خون جیسا ہو جاتا تھا۔ ان سب کے مادی اسباب تو ضرور ہوں گے؟ صحرا' ہریالی' دریا کا قرب' نمی تو ٹڈی دل' جوئیں' مینڈکوں وغیرہ کے ظاہری اسباب ہیں۔ تو کیا انہیں عذاب کہہ لیں؟ قرآن' حدیث تو کہہ رہے ہیں۔

ایک اور بہت ضروری بات بھی پوچھنی تھی۔ آپ اسباب کے آدمی ہیں۔ کورونا وائرس کا کوئی مادی علاج ہے آپ کے پاس؟ اگر نہیں تو دعا بھی چھوڑ دیں؟ علاج سے بھی جائیں' دعا سے بھی؟

اور اب یہ سب کہتے کہتے مجھے ایک اور خیال پیدا ہو چلا ہے۔ کہیں کسی چیز کو عذاب نہ ماننے کی دانش کے پیچھے دراصل عذاب بھیجنے والے کا انکار تو نہیں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اصل انکار یہاں نہ ہو اس سے پیچھے ہو؟...... اور چونکہ آزادیٔ اظہار کی دعوت آپ ہی سے ہمیشہ ملی ہے۔ اس لیے آپ سے ڈرتے ڈرتے کہہ رہا ہوں کہ کہیں ایسی دانش بذاتِ خود عذاب تو نہیں ہے؟ نہ ٹلنے والا عذاب۔ ایسا عذاب' جس سے کہیں پناہ نہ ملتی ہو....؟

[بشکریہ روزنامہ دنیا، ۲۹ر اپریل ۲۰۲۰ء]

مولانا ابوسفیر خیر الامین قاسمی، مردان

مولانا محمد مکی حجازی صاحب کا تساہل

اکابر اہل سنت دیوبند متشدد نہیں متصلب ہیں:

اکابر اہل سنت دیوبند کو اللہ تعالیٰ نے اِس آخری زمانے میں حق وصداقت کی پہچان اور اہل السنۃ والجماعۃ کا صحیح ترجمان ونمونہ بنایا ہے۔ الحمدللہ! جن بے پناہ علمی وعملی خوبیوں سے خداوند قدوس نے اسلافِ اہل سنت دیوبند کو نوازا ہے اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ حضرات مسلکی اعتبار سے نہ تو ''مداہنت اور تساہل'' کے روادار ہیں اور نہ ہی کسی ''تعنت، تشدد اور تعصب'' کے طرف دار، بلکہ افراط وتفریط کی اِن دونوں راہوں کے بیچ و بیچ ''تصلب'' والی اعتدال وانصاف کی راہ پر پوری قوت واستقامت کے ساتھ قائم رہتے ہیں۔ یعنی اکابر اہل سنت دیوبند عقائد ونظریات میں نہ تو متشدد ہیں نہ ہی متساہل۔ بلکہ یقینی اور بجا طور پر متصلب ہیں۔ اور یہ تصلب قرآن میں اہل ایمان سے مطلوب ہے۔ اہل علم کے لیے تساہل کی طرح تعصب و تصلب کا معنی بھی واضح ہے، لیکن بعض لوگ تصلب وتشدد کے درمیان نمایاں فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں، جس سے الجھنیں اور اشکالات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اِس لیے ہم مختصراً معنی ذکر کیے دیتے ہیں۔

تصلب، تشدد اور تساہل کا معنی ومفہوم:

''تصلب'' کا لغوی معنی ہے: پختگی اور مضبوطی۔ عقائد وافکار میں تصلب یہ ہے کہ انسان عقائد حقہ پر پوری مضبوطی کے ساتھ کاربند رہے۔ سرمو انحراف واختلاف نہ کرے۔

اور ''تشدد وتعصب'' کا معنی لغت میں ہے: ہٹ دھرمی، بے جا طرف داری۔ حقیقت ظاہر ہونے کے باوجود حق بات سے انکار۔ اور عقائد میں تشدد یہ ہے کہ کسی فرعی اختلافی مسئلے میں ایک قول کو حق اور باقی اقوال کو باطل قرار دینا۔ یا فرعی اختلاف کو اُصولی اختلاف قرار دے کر دوسرے فریق کو گمراہ سمجھنا۔

اور اہل لغت نے ''تساہل'' کا معنی: ''غفلت، بے احتیاطی اور تسامح'' سے کیا ہے۔ عقائد و نظریات میں تساہل یہ ہے کہ انسان اُصولی اختلاف کو فروعی اختلاف اور اتفاقی واجماعی مسئلہ کو اختلافی مسئلہ کے درجے میں رکھ کر اس کی اہمیت گھٹا دے۔

گویا تصلب ایک محمود و قابل تعریف چیز ہے، جبکہ تشدد ایک مذموم اور لائق ترک چیز۔

مذکورہ بالا الفاظ کا معنی و مفہوم اور ان کے درمیان فرق معلوم ہونے کے بعد اکابر اہل سنت دیوبند کے مزاج سے واقفیت بھی ضروری ہے تاکہ یہ حقیقت آشکارا ہو جائے کہ ہمارے اکابر خود بھی متصلب تھے، اور اپنے متعلقین کو بھی تصلب کی تعلیم و ترغیب دیتے تھے۔ جبکہ تساہل و تشدد سے خود بھی بچتے تھے اور دوسروں کو بھی بچانے کی فکر کرتے تھے۔

مثال (۱):

استاذ المحدثین شیخ سلیم اللہ خان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

”لوگ کہا کرتے ہیں کہ جو دوسرے حیاتی مولوی مماتیوں کے خلاف ہیں وہ تو اتنے سخت نہیں ہیں، یہ (مولانا سلیم اللہ خان رحمہ اللہ [ناقل]) بہت سخت ہے۔ تو میں کہا کرتا ہوں کہ: اُنہوں نے دیوبند دیکھا بھی نہیں، انہوں نے دیوبند میں وقت ہی نہیں گزارا۔ اور ایک اور بات، بہت سے لوگوں نے (دیوبند میں وقت) گزارا ہے مگر فقط ایک سال۔......مگر میں نے وہاں پانچ سال گزارے ہیں۔ اس لیے میں جس طرح علمائے دیوبند کے مزاج و مذاق سے واقف ہوں۔ یہ تو نہیں کہتا کہ اور کوئی واقف نہیں! مجھ سے زیادہ واقفیت رکھنے والے بھی ہوں گے۔......اور دیوبند کا مزاج مماتیوں کے مطابق ہرگز نہیں۔ اس لیے میری درخواست ہے اپنے ان دوستوں سے، کہ وہ مماتیوں ہی کے مدرسے میں جایا کریں ہمارے مدرسوں میں نہ آیا کریں۔“ [ماہنامہ الفاروق بابت ماہ رمضان المبارک ۱۴۳۴ھ]

ایک طرف علمائے دیوبند کے سرخیل مولانا سلیم اللہ خان رحمہ اللہ کا تصلب ہے جو مماتیوں کو دیوبندی نہیں سمجھتے اور انھیں اپنے مدرسہ میں رکھنے کے لیے تیار نہیں۔ دوسری مولانا مکی حجازی صاحب کا تساہل جو مماتیوں کو دیوبندی تسلیم کر کے ان کی تفسیر کی طرف دھیمی لہجے میں دعوت دے رہے ہیں۔

مثال (۲):

مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلوی مرحوم جامعہ بنوری ٹاون کراچی کے شعبہ دعوت وارشاد کے صدر تھے۔ ابتدا میں حضرت کے مضامین مسلک اہل سنت کے تائید اور عقائد شیعہ کی تردید میں چھپتے تھے۔ تو اس وجہ سے قائد اہل سنت حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحب رحمہ اللہ نے بھی ان کی تائید فرمائی حتی کہ انہیں اپنی قائم کردہ جماعت ”تحریک خدام اہل السنۃ والجماعۃ پاکستان“ کی سرپرستی قبول کرنے کی پیش کش بھی کی تھی۔ لیکن جب حضرت قاضی صاحب رحمہ اللہ کو پتہ چلا کہ یہ حضرت مشاجرات صحابہ میں اہل سنت کے مسلک سے کنارہ کش ہیں تو پھر قاضی صاحب نے نہ اُن کے عہدے کو دیکھا اور نہ شخصیت کو۔ بلکہ صرف اور

صرف اکابر اہل سنت دیوبند کے مسلک کو پیش نظر رکھا اور اِس معاملے میں مسلکی تصلب کا ثبوت دیتے ہوئے مولانا سندیلوی مرحوم کی غلطی کو خواب واضح کیا۔ تفصیل کے لیے حضرت قاضی صاحب رحمہ اللہ کی کتاب ''خارجی فتنہ جلد اول'' کی طرف رجوع فرمائیں۔

بعض حضرات خود ''متساہل'' ہوتے ہیں، مگر اکابر کو متشدد و متعصب قرار دے کر اپنے تساہل پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اکابر اہل حق کی تعلیمات اور طرزِ عمل سے بخوبی واضح ہے کہ مسلک کے معاملے میں خوامخواہ شخصیات کی رعایت نہیں کی جاتی۔ اِسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ کسی مقبول سے مقبول ترین شخصیت نے بھی اگر کسی عقیدہ میں اہل حق کا دامن چھوڑ دیا تو اکابر اہل سنت دیوبند اُس کی نشاندہی ضرور فرماتے ہیں۔ امام اہل سنت شیخ سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ اور قائد اہل سنت حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحب رحمہ اللہ کی تحریرات اور کتب اس پر شاہد عدل ہیں۔

مثال (۳):

ایک نامی گرامی پیر صاحب جو بہت بڑی شخصیت کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں، مریدین کا حلقہ بھی بہت وسیع رکھتے ہیں۔ ایک زمانے میں دفاع صحابہ کے عنوان سے بہت سرگرم رہے۔ لیکن اہل بدعت کے حوالے سے جب انہوں نے اکابرِ اہل سنت دیوبند کے تحقیقی مسلک کو چھوڑ دیا نیز اجتماعی مجالس ذکر جہری کے لیے تداعی وغیرہ کا شکار ہوگئے تو قائد اہل سنت رحمہ اللہ کا قلم حرکت میں آیا اور اُن پیر صاحب کا اکابر کے ساتھ اختلاف واضح کر کے اُن کو رجوع الی الحق کی دعوت دی۔ تفصیل ماہنامہ حق چار یار کے شماروں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ حالانکہ وہ پیر صاحب خود کو حضرت قاضی صاحب کے حلقہ ادارت میں شامل کرتے تھے، اور اُن کے واسطے سے حلقہ وسیع ہونے اور جماعت کے پھیلنے کا امکان تھا، مگر حضرت قائد اہل سنت رحمہ اللہ نے مسلکی معاملات میں کسی دنیاوی یا جماعتی مفاد کی طرف ادنیٰ توجہ بھی نہ فرمائی۔

آمدم برسر مطلب:

اکابر اہل سنت دیوبند کی تعلیمات و مزاج و مذاق کے برعکس آج کل ''تساہل'' کا دَور دَورہ ہے۔ تصلب کو تشدد قرار دے کر تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ عقائد و افکار کے بجائے شخصیات کی رعایت کی جانے لگی ہے۔ جو شخص کسی بڑی مسند پر بیٹھ جائے، یا ذرا مشہور ہو جائے تو پھر اُسے کھلی چھوٹ ہے، وہ جو چاہے کہے، اس کے منہ سے نکلی کوئی بات غلط ہو ہی نہیں سکتی چاہے اکابر کی تصریحات چیخ چیخ کر اس کی تغلیط کرتی رہیں، کیونکہ ؏ مستند ہے شیخ کا فرمایا ہوا

ایسا رویہ اختیار کرنے والوں میں ایک نام مولانا مکی حجازی صاحب کا بھی ہے۔ جو اپنی نسبت علماء دیوبند کی طرف کرتے ہیں، لیکن بہت سے معاملات میں اکابر دیوبند کے خلاف طرز اپنائے ہوئے ہیں۔

مولانا طارق جمیل صاحب اور مولانا مکی حجازی صاحب کا تساہل:

آج سے تقریباً دس بارہ سال قبل حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ نے آزاد مبلغ مولانا طارق جمیل صاحب پر کچھ تبصرہ فرمایا تھا، (جس میں بہت سے مسائل میں آزاد مبلغ کا طریقۂ واردات بیان فرمایا تھا۔) جس کے عینی گواہ موجود ہیں۔ وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ حضرت رحمہ اللہ کا تبصرہ مبنی بر حقیقت تھا۔

حال ہی میں مولانا طارق جمیل صاحب نے ایک بیان میں حضرت یوسف علیہ السلام سے متعلق ایسی بات کہی جو توہین کے زمرے میں آتی ہے۔ اِس پر بہت سے علماء نے تنقید فرمائی۔ ایک سوال کے ذریعہ بغیر نام لیے مولانا طارق جمیل صاحب کی بات مولانا مکی حجازی صاحب کے سامنے رکھی گئی تو مکی صاحب نے دِل کھول کر اس کو کفر قرار دیا لیکن جب مکی صاحب کو پتہ چلا کہ اس کے قائل مولانا طارق جمیل صاحب ہیں تو پھر مکی صاحب نے تساہل اختیار کر لیا۔

اشاعۃ التوحید والسنۃ اور مولانا مکی حجازی صاحب کا تساہل:

اس کی دوسری مثال جماعت اشاعت التوحید والسنۃ یعنی پنج پیری (مماتی) حضرات ہیں۔ جن کو تمام اکابر و اصاغر علماء دیوبند نے گمراہ اور اہل سنت سے خارج قرار دیا ہے اور بڑے واضح الفاظ میں فرمایا ہے کہ دیوبندیت کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں۔

لیکن اکابر کی تحقیقات کے برعکس مولانا مکی حجازی صاحب کی ایک گفتگو آج کل گردش کر رہی ہے جس میں وہ فرمارہے ہیں کہ: یہ (مماتی) لوگ قرآن کی بہت خدمت کر رہیں ہے۔ اور ان کے ترجمہ قرآن میں طلباء زیادہ ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی الحمد للہ دیوبند کی جماعت ہے۔ اور حیات ممات کو چھوڑو۔ قیامت میں خدا اِن کے بارے میں نہیں پوچھے گا۔ کیا صحابہ میں یہ چھوٹے چھوٹے اختلافات نہیں ہوتے تھے۔

اناللہ وانا الیہ راجعون!! مولانا مکی صاحب! کاش کہ آپ اس مسند کا خیال فرماتے جس پر آپ تشریف فرما ہیں۔ کاش آپ اس اسٹیج سے اکابر اہل سنت دیوبند کی تحقیقات بیان فرماتے۔

اشاعۃ التوحید والسنۃ والے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو روضہ مبارک میں نعوذ باللہ لکڑی اور پتھر کی طرح بے جان سمجھتے ہیں۔ اسی طرح سماع موتی کے عقیدے کو ''شرک'' قرار دیتے ہیں۔ ان کا یہ فتویٰ صحابہ پر بھی لگ رہا ہے۔ اور بھی ان کے بہت سے عقائد اہل سنت کے خلاف ہیں۔

مولانا مکی صاحب سے مؤدبانہ سوال:

میرا مولانا مکی صاحب سے مؤدبانہ سوال ہے کہ: کیا اکابر اہل سنت دیوبند نے متفقہ طور پر منکرین حیات انبیاء (جمعیۃ اشاعت التوحید والسنہ) کو گمراہ اور خارج از اہل سنت قرار نہیں دیا؟......کیا مسئلہ حیات النبی کا تعلق عقیدے سے نہیں بلکہ ''چھوٹے چھوٹے اختلاف'' سے ہے؟......کیا انبیاء کی حیات فی القبر کے بارے میں صحابہ کرام کا اختلاف ہے؟......کیا کسی اجماعی عقیدے کا انکار گمراہی نہیں ہوتا؟......اور کیا درست عقیدے کو چھوڑ کر گمراہی اختیار کرنے والوں سے قیامت کے دن پوچھ گچھ نہیں ہوگی؟......ایک شخص سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا دفاع کر رہا ہے، آپ اسے فرماتے ہیں کہ: چھوڑو! اِس بارے میں قیامت میں پوچھ گچھ نہیں ہوگی۔ کیا صحابہ کا دفاع واجب نہیں ہے؟

مجھے بہت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ مولانا مکی حجازی صاحب جیسا شخص عقیدہ ''حیات النبی'' کو اُن فروعی مسائل سے تشبیہ دے رہا ہے جو صحابہ کے مابین اختلافی تھے۔ میں مولانا مکی صاحب سے مکرر عرض کروں گا ذرا جرأت فرما کر کسی ایک صحابی کا نام ارشاد فرمائیں جو انبیاء کی حیات فی القبر کے منکر تھے۔۔!!

حضرت امام اہل سنتؒ نے دسیوں سال قبل یہ چیلنج فرمایا تھا کہ: ۱۸۵۷ء سے پہلے اہل سنت کے طبقات میں سے کسی ایک شخصیت کا نام پیش کیا جائے جو عقیدہ حیات کی منکر ہو! مماتی آج تک اُن کے چیلنج کا جواب نہیں دے سکے اور نہ ہی قیامت تک دے سکتے ہیں۔ اِس حوالے سے ترجمان دیوبند مولانا نور محمد تونسویؒ کا قیمتی مضمون ''مولانا سرفراز خان صفدرؒ کے چیلنج کا لوہا!'' بھی قابل دید ہے۔

خدارا! اپنے بڑوں کے مشن اور ان کی محنتوں پر پانی مت پھیریئے! جن مشہور پیر صاحب کا تذکرہ گزشتہ سطور میں گزرا ہے، وہ مجلس میلاد کے اختلاف کو حنفی شافعی اختلاف سے تشبیہ دیا کرتے تھے، اور آنجناب نے حیات ممات کے اختلاف کو فروعی اختلاف جیسا قرار دے دیا۔

خدارا! تساہل کی بجائے تصلب اپنایئے! یقین جانیے! اپنے اکابر کے ساتھ رہنے میں برکت ہے، **البرکۃ مع اکابرکم**. آپ ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔

بندہ ناچیز کی یہ تحریر نہ تو تنقید برائے تنقید ہے نہ آپ کو نصیحت! یہ تو بس حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ اور امام ربانی حضرت گنگوہی رحمہما اللہ کے ماننے والوں میں سے ایک ادنیٰ سے طالب علم کی دِل کی آواز ہے جو آپ اور عوام وخواص اہل سنت دیوبند تک پہنچانا ضروری سمجھتا ہوں۔ فإلی اللہ المشتکی..

☆......☆......☆......☆

مولانا مفتی عبید الرحمٰن، مردان

جمہوریت اور اسلام: ایک مطالعہ

اسلام کا نظام سیاست وحکومت کیا ہے؟ جمہوریت کا اسلام سے کیا رشتہ ہے؟ خلافت وجمہوریت میں کیا فرق ہے؟ دین اسلام اپنے ماننے والوں سے کسی خاص نظام حکومت کا تقاضا کرتا ہے یا نہیں؟ اگر دینِ اسلام کسی خاص نظام حکومت کا متقاضی ہے تو اس نظام کے بنیادی خدوخال کیا ہیں؟

یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر لکھتے لکھتے پوری ایک صدی گزرنے کو ہے جس میں موضوع سے متعلق تقریباً ہر ہر گوشہ پر کافی کچھ لکھا گیا، اس پورے عرصہ میں اس مسئلہ پر اس قدر کتابیں اور مضامین لکھے جا چکے ہیں کہ ان کو اگر جمع کیا جائے تو پوری ایک وسیع لائبریری بن جاتی ہے، اس لئے اس موضوع پر مزید کچھ لکھنے کی ویسے تو ضرورت محسوس نہیں ہوتی لیکن حال ہی میں اس موضوع سے متعلق کچھ تازہ تحریرات سامنے آئیں جن میں ''اسلام، جمہوریت اور آئین پاکستان'' کے نام سے محترم جناب محمد اسرار مدنی صاحب کی ایک کتاب بھی ہے جو ابھی کچھ دنوں پہلے منظر عام پر آئی ہے، اس کتاب میں مجموعی طور پر جمہوریت اور اسلام کے درمیان رشتہ جوڑنے کی پوری کوشش کی گئی ہے، جمہوریت کی متعدد خوبیاں دکھائی گئی، اس پر متعدد دلائل ذکر کئے گئے اور اتنی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے جس سے قاری یہ تاثر لیتا ہے کہ جمہوریت اسلام ہی کا ایک نظام حکومت ہے، جمہوریت کے علاوہ دین اسلام کا الگ کوئی قابلِ عمل نظام حکومت نہیں ہے۔

چنانچہ ''جمہوریت کا اسلامی تصور'' کے عنوان کے تحت فاضل مؤلف تحریر فرماتے ہیں:

> ''جمہوریت کا سادہ سا مطلب یہ ہے کہ عوام کے اجتماعی معاملات کو چلانے کے لئے عوام کی اکثریت کی رائے پر عمل کیا جائے، یہ نہ صرف انتہائی فطری اور واحد قابل عمل طریقہ ہے بلکہ دین کے تقاضوں کے بھی عین مطابق ہے، قرآن کریم کا حکم ''وامرھم شوریٰ بینھم'' اسی کا بیان ہے۔ اس حکم کا تقاضا محض یہ نہیں ہے کہ ان سے رسمی طور پر مشورہ کرلیا جائے بلکہ ان کے مشورہ کے مطابق ہی فیصلہ کیا جائے اور یہ مشورہ بھی کسی خاص طبقہ یا گروہ تک محدود نہ ہو بلکہ تمام لوگوں کو مشورے/رائے کا یکساں حق دیا جائے، اسی کا نام جمہوریت ہے۔''

اس کے کچھ سطر بعد لکھتے ہیں:

> ''جمہوریت کا متبادل صرف اور صرف آمریت ہے۔''

یوں تو پوری کتاب اس بات کی متقاضی ہے کہ ہر ہر باب کو بحث وتحقیق کا موضوع بنا کر اس پر

مستقل کلام کیا جائے، لیکن فی الحال مختلف عناصر کی وجہ سے ایسا کرنا مشکل ہے، یہاں صرف خلافت وجمہوریت کی حد تک چند ایک نظریات پر کلام کرنا ضروری معلوم ہوا، آسانی پیدا کرنے کے لیے اس بحث کو مندرجہ ذیل ترتیب دے کر اختصار کے ساتھ بیان کرنا مفید معلوم ہوتا ہے:

الف: اسلام کا کوئی نظام حکومت ہے یا نہیں؟

ب: اسلام کے نظمِ حکومت اور جمہوریت میں کیا بنیادی فرق ہے؟

ج: متعلقہ شبہات کا جائزہ۔

اسلام کا نظم حکومت:

دینِ اسلام ایک کامل ضابطہ حیات ہے اس میں انسانی زندگی کے تمام تر مراحل کے متعلق کچھ احکام دیئے گئے ہیں، حیات انسانی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جس میں وہ شرعی احکام سے آزاد و بالاتر ہو بلکہ مسلمان اپنے دین وایمان کی رو سے تمام شرعی احکام کا مکلّف ہے، جس طرح انفرادی زندگی کے متعلق یہ تصور کیا جاتا ہے کہ زندگی کے ہر موڑ پر اس کی طرف کچھ شرعی احکام متوجہ ہوتے ہیں یوں ہی اجتماعی زندگی کے متعلق بھی شریعتِ اسلامیہ نے کچھ ہدایات وتعلیمات دی ہیں جن کی پابندی کرتے رہنا ضروری ہے، سیاست وحکومت بھی اجتماعی زندگی ہی کا ایک لازمی اور بنیادی حصہ ہے، اس لئے یہاں بھی مسلمان آزاد نہیں ہیں کہ چاہے حکومت قائم کریں یا نہیں؟ اور حکومت قائم کرنے کی صورت میں خواہ کوئی بھی طرزِ حکومت قائم کریں؟

بلکہ اس میدان میں بھی شریعتِ اسلامیہ نے مسلمانوں کو کچھ احکام وہدایات دیئے ہیں جن کی پابندی کرنے کا ان کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے، یہ درست ہے کہ قرآن وسنت نے نام لے کر کسی خاص نظم حکومت قائم کرنے کو متعین طور پر فرض قرار نہیں دیا بلکہ مجموعی طور پر یہ بات امت کے صوابدید پر چھوڑ رکھی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ حکومت کی جو کچھ ذمہ داریاں اور اغراض ومقاصد بتلائی گئی ہیں، اس سے پوری وضاحت کے ساتھ یہ بات معلوم کی جاسکتی ہے کہ نظام حکومت کے متعلق اسلام کی تعلیم کیا ہے؟ اور وہ اپنے ماننے والوں سے کس نظامِ حکومت کے قیام کا تقاضا کرتا ہے؟

سورۃ حج میں ہے: الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ .[الحج: ٤١]

اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی نظر میں بادشاہت وحکومت بذات خود مقصود نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصود یہی ہے کہ:

۱۔ اربابِ حکومت اقامتِ صلوۃ کا اہتمام کریں۔ ۲۔ نظامِ زکوۃ کی پابندی کریں۔

۳۔ امر بالمعروف کریں۔ ۴۔ نہی عن المنکر کریں۔

''معروف'' کے عموم میں تمام نیکیاں داخل ہیں، جس میں توحید سے لے کر مندوبات و مستحبات تک شامل ہیں، یوں ہی ''منکر'' گناہ اور نافرمانی کو کہا جاتا ہے جس کے ضمن میں ادنیٰ نافرمانی یعنی مثلاً مکروہات سے لے کر کفر وشرک تک کی تمام نافرمانیاں اور سارے کبیرہ وصغیرہ گناہ شامل ہو گئے، اس کی اگر کوئی جامع وآسان تعبیر ہوسکتی ہے تو یہی کہ حکومت وبادشاہت کا مقصود اقامتِ دین ہے، اَب جس نظامِ حکومت کا منشا دینِ اسلام اور اس کے احکام کی تنفیذ ہو وہ اسلامی نظام حکومت ہے، اس کے قیام وبقاء کے لئے کوشش کرنا اسلامی نظامِ سیاست کہلائے گی اور جو نظم اس پیمانہ پر پورا نہ اترے یعنی یا تو سیاست وحکومت کا مقصود اقامتِ دین نہ ہو یا طریقِ کار قرآن وسنت کی تعلیمات سے متصادم ہو وہ اسلامی نظام حکومت وسیاست کہلانے کا کسی طرح مستحق نہیں ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ اور خلفاء راشدین نے اپنے اپنے زمانے میں سیاست وحکومت کی جو ترتیب اختیار فرمائی تھی وہ اس آیت کریمہ کی پوری پوری مصداق تھی جس کا اوڑھنا بچھونا اقامتِ دین اور احکام اسلام کا نفاذ تھا۔ اور اگر عقلی طور پر غور وتدبر سے کام لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ ان حضرات نے حکومت کا جو کچھ طریقہ کار اپنایا تھا اس کے بغیر اقامتِ دین کا تصور کرنا مشکل ہے، مکمل اسلام کو عملی جامہ پہنانے اور اس کو ایک زندہ جاوید دین ومذہب کی حیثیت سے نافذ کرنے کا یہی واحد قابلِ عمل راستہ ہے جس پر خلفاء راشدین گامزن تھے، اس سے یہ بات بھی صاف ہوگئی کہ جو لوگ قیامِ خلافت کو امتِ مسلمہ کے اجتماعی فرائض میں سے شمار کرتے ہیں ان کی بات اپنی جگہ بالکل درست ہے۔

لہٰذا اسلامی نظامِ حکومت وہی کہلائے گا جس کا نصب العین ہی اقامت دین ہو اور ظاہر ہے کہ صرف زبان سے نام لینے سے کوئی چیز مقصود اور نصب العین نہیں بن جاتی جبکہ نظریاتی طور پر بھی اور عملی سطح پر بھی اس چیز کو مدنظر نہ رکھا جائے، اس لیے صحیح اسلامی حکومت وہی ہے جو نظریاتی اور عملی، ہر سطح پر بھی دین اسلام کی تعلیمات وہدایات کے تابع ہو اور اس کا کوئی شعبہ ونظام دینِ اسلام کے احکام سے متصادم نہ ہو۔

قرآن وسنت میں نظام اور طرزِ حکومت سے جتنی نصوص متعلق ہیں ان سب کا حاصل تقریباً یہی ہے۔

اسلام اور جمہوریت:

اسلام کے اس نظریہ حکومت کو سمجھنے کے بعد جب ہم جمہوریت کے ساتھ اس کا تقابلی جائزہ لیتے ہیں تو صاف طور پر دکھائی دیتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے ایسے متضاد ہیں کہ کہیں یکجا جمع نہیں ہوسکتے، دونوں میں نظریاتی، عملی اور مشاہداتی طور پر اس حد تک تغایر ہے جس کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اسلامی نظامِ حکومت (جس کو بجا طور پر ''خلافت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔) کا بنیادی مقصد اقامتِ دین ہے جبکہ جمہوریت کا مقصود یہ نہیں ہے، چنانچہ دین کا جامع تصور تو قاموسِ جمہوریت میں سرے سے

موجود ہی نہیں، جمہوری حکومت کا مقصود مؤلف کے کہنے کے مطابق یہ ہے کہ: اجتماعی معاملات عوام کی اکثریت کی رائے کے مطابق انجام پائیں۔عوام کی اکثریت کی رائے کسی چیز کی پابند نہیں، ان کی رائے حرف اخیر کی حیثیت رکھتی ہے خواہ وہ کسی دین وشریعت کے مطابق ہو یا مخالف، خلافت اور اسلامی نظم حکومت میں دین وشریعت کی بالا دستی ہوتی ہے جبکہ جمہوریت میں عوام کی۔

تضاد ہو تو ایسا:

یہ دونوں نظامہائے مملکت کے درمیان جوہری فرق ہے اور یہ صرف ایک فرق ہی نہیں ہے جس کو ہلکا سمجھا جائے اور دونوں نظاموں کے درمیان قدرِ اشتراک تلاش کر کے اس فرق کو نا قابل اعتناء رکھا جائے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اغراض ومقاصد کا ایک فرق اپنے دامن میں بیسیوں فروق رکھتا ہے، مثال کے طور پر عام جانور اور انسان کے درمیان ایک عقل ہی کا فرق ہے، لیکن یہ ایک فرق سینکڑوں جزوی امور میں اشتراک سے زیادہ بھاری اور وزنی ہے اور اسی ایک فرق کی وجہ سے دونوں کے نام وکام اور مقام ومرتبہ میں اس حد تک فرق پیدا ہوا جس کی وجہ سے دونوں چیزیں بالکل جدا جدا حقیقت کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں، حالانکہ دیکھا جائے تو ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان وغیرہ دسیوں چیزیں دونوں کے درمیان مشترک بھی ہیں، یوں ہی خلافت وجمہوریت کے درمیان اس ایک بنیادی فرق کی وجہ سے دونوں کے درمیان قدم قدم پر اس حد تک تضاد وتصادم کی فضاء قائم ہوجاتی ہے جس کے ہوتے ہوئے دونوں نظامہائے مملکت ایک جگہ سفر نہیں کر سکتے، دونوں کے اہداف بھی الگ اور طریقِ عمل بھی مختلف ہے۔

خلافت وجمہوریت کا فرق:

مقصود کا یہی ایک فرق ہے جس کی وجہ سے دونوں نظاموں کے درمیان بیسیوں تضادات پیدا ہوئے، جن کا ایک مختصر سا نمونہ یہ ہے کہ:

انتخاب امیر کا فرق اور انتخابات کے مفاسد:

۱......خلافت میں خلیفہ وامیر کے انتخاب کا طریقہ کار یہ ہے کہ اہل حل وعقد کسی صالح ومناسب شخص کا انتخاب کریں، جبکہ جمہوریت میں انتخابات کا طوفان آزمایا جاتا ہے، اور انتخابات کی حیثیت دین واسلام اور ایمان وتقویٰ کی زندگی کے لیے ایسی ہی ہوتی ہے جو شہر وآبادی کے لئے سونامی طوفان کی ہوتی ہے، انتخابات کے چند ایک دنوں میں ملک عزیز میں جھوٹ وفریب، وعدہ خلافی اور معاہدہ شکنی، غیبت وتہمت تراشی، رشوت ستانی، اسراف وتبذیر، فحاشی وبے حجابی، (تصویر بازی)، جھوٹی قسموں، نماز اور صلہ رحمی وغیرہ دینی ومعاشرتی واجبات وحقوق کے ضیاع، وغیرہ طرح طرح کے گناہوں کا امڈتا ہوا سیلاب ہوتا ہے جس سے معاشرے کے چھوٹے بڑے، مرد وعورت سب کے دامن گندے ہوجاتے ہیں، دردِ دل اور دیانت وانصاف

کی نظر سے اگر دیکھا جائے کہ ان دِنوں میں پورے ملک کے طول و عرض کتنے لوگ گناہ میں ملوث ہو جاتے ہیں اور کتنی باران گناہوں کو دہرایا جاتا ہے؟ تو واضح ہو جائیگا کہ یہ ایام گناہوں اور معاصی کا موسم ہے اور اس طوفان بدتمیزی میں بلا مبالغہ لاکھوں منکرات کا ارتکاب ہوتا ہے۔

امن اور فساد کا مفہوم:

اگر اس کے باوجود جمہوریت کے فضائل میں سے ''پرامن طریقہ پر انتقال اقتدار'' کو گنوایا جائے جیسا کہ فاضل مؤلف نے تحریر فرمایا ہے، تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ کہنے والے کے نزدیک امن کا معیار وہ نہیں ہے جو ایک مسلمان کا معیار ہونا چاہئے، دین وشریعت کی زبان میں فساد محض مسلح جنگ ہی کو نہیں کہا جاتا جس سے بچنے کو امن قرار دیا جائے، یہ تو خالص مادی اور مغربی تصور ہے، شریعت کی روشنی میں قرآن وسنت کے احکام کی خلاف ورزی فساد ہے، خواہ ظاہر میں جنگ کی کوئی صورت نہ ہو، لہٰذا اگر کچھ لوگ خوشی خوشی سود، جوا، بدکاری وغیرہ کسی بھی گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں تو ظاہر میں وہ کتنے ہی شیر وشکر کیوں نہ ہوں لیکن شریعت کی نظر میں وہ ہے فساد، اسی طرح اگر کوئی بندہ خدا شریعت کی سربلندی کے لئے شرعی احکام کی روشنی میں مسلح جنگ وجہاد کرتا ہے تو بظاہر یہ جنگ وفساد ہی کیوں نظر نہ آئے لیکن شریعت کی نگاہ بصیرت میں یہ ہے امن۔

امام طبری رحمہ اللہ سورہ بقرۃ کی آیت کریمہ ''لا تفسدوا فی الارض ''کی تفسیر میں ذکر فرماتے ہیں:

أما ''لا تفسدوا فی الأرض''، فإن الفساد، هو الكفر والعملُ بالمعصية.

اس کے بعد اپنی سند کے ساتھ حضرت ربیع سے نقل کرتے ہیں کہ:

عن الرَّبيع: (وإذا قيل لهمُ لا تفسدوا في الأرض) يقول: لا تعْصُوا في الأرض (قالوا إنما نحن مصلحون)، قال: فكان فسادُهم ذلك معصيةَ الله جل ثناؤه، لأن من عَصى الله في الأرض أو أمر بمعصيته، فقد أفسدَ في الأرض، لأن إصلاحَ الأرض والسماء بالطاعة. [جامع البیان: ۱/۲۸۸، ت: شاکر] ترجمہ: ربیع سے روایت ہے: کہ ان (منافقوں) کا زمین میں فساد پھیلانا یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کیا کرتے تھے۔ جس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور گناہوں کی دعوت دی اس نیز میں میں فساد پھیلایا، اس لئے کہ زمین وآسمان کی اصلاح اور درستگی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ہے۔

مولانا صوفی عبدالحمید سواتی صاحب رحمہ اللہ نے بجا طور پر فرمایا کہ:

''فساد اور اصلاح متضاد چیزیں ہیں، اعتدال کی حالت کو اصلاح، اور اعتدال سے خروج کو فساد کہتے ہیں، لڑائی بھڑکانا، فتنہ برپا کرنا، کافروں سے دوستی، مسلمانوں سے دھوکا، ان کے رازوں کا افشاء، گناہوں کا اظہار، دین کی اہانت، قوانین شریعت کی خلاف ورزی، یہ سب فساد فی الارض کے کام ہیں، ان لوگوں کے نزدیک فلاح اور اصلاح محض معاش کی درستگی ہے، یہ لوگ نظام حق کو بگاڑتے ہیں، عبادت الٰہی کی بجائے کفر وشرک کے مرتکب ہوتے ہیں، غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں، یہی فساد ہے، امام طبری اور ابن کثیر،

متعدد مفسرین کرام سے روایت کرتے ہیں کہ: ”اصلاح الارض والسماء بالطاعۃ“ زمین وآسمان کی اصلاح اطاعت کے ذریعے ہوسکتی ہے، اطاعت ہوگی تو ارض وسماء کے معاملات درست ہوں گے، اگر اللہ تعالیٰ کے قانون اور اس کے رسول کی اطاعت نہیں ہوگی تو زمین پر فساد کے سوا کچھ نہیں ہوگا اور منافقین یہی کچھ کرتے ہیں۔“ [معالم العرفان: ۲/۷۵]

علامہ اقبال رحمہ اللہ نے بھی اس نکتہ کو آشکارا فرمایا:

اللہ سے کرے دُور تو تعلیم بھی فتنہ — اَملاک بھی اولاد بھی جاگیر بھی فتنہ
ناحق کے لیے اٹھے تو شمشیر بھی فتنہ — شمشیر ہی کیا نعرۂ تکبیر بھی فتنہ

امن وفساد کے اس تصور کو سمجھنے کے بعد جب ہم غور کرتے ہیں تو واضح ہوجاتا ہے کہ جمہوریت میں اقتدار کے انتقال کا جو طریقہ مروج ہے وہ پرامن نہیں ہے بلکہ فسادات کا ملغوبہ ہے اور اس میں جس قدر فسادات ہوتے ہیں وہ اس نظام بادشاہت کے طریقہ انتقال کی بنسبت کئی گنا زیادہ ہیں جس کی ظلم وزیادتی اور مذمت کا حد سے زیادہ ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے۔

معیار انتخاب کا فرق:

۲......معیار انتخاب بھی جدا جدا ہے، خلافت کے لئے انتخاب کا معیار یہ ہے کہ آدمی نیک وصالح ہو اور نظم مملکت کو شرعی رہنمائی کی روشنی میں چلانے کا فن جانتا ہو، جمہوریت کے انتخاب کا معیار یہ نہیں ہے بلکہ اگر کسی ملک میں واقعی جمہوری نظام اور جمہوری اقدار قائم ہو تو وہاں معیار یہ ہے کہ عوام کی رائے پر زیادہ سے زیادہ چلنے والا ہو، ان کو مادی لحاظ سے آرام وسکون پہنچا کر راضی کرنے والا ہو، ترقی پذیر ممالک میں انتخاب کا معیار یہ ہوتا ہے کہ مغربی استعمار کے لئے زیادہ مفید اور ان کی اشاروں پر چلنے والا ہو، جن ممالک میں مالی خیانت اور بددیانتی کی وباء ہوتی ہے وہاں عوام کی طرف سے انتخاب یہ ہوتا ہے کہ پورے ملک کے حقوق سے زیادہ سے زیادہ انہی کی جھولیاں بھردی جائیں۔

مدت انتخاب:

۳......مدت انتخاب بھی دونوں نظاموں میں مختلف ہے، خلیفہ کا انتخاب کسی محدود مدت تک کے لیے نہیں ہوتا جس کے بعد وہ بلاوجہ معزول ہوجائے گا، بلکہ ہمیشہ کے لئے ہوتا ہے، البتہ کسی وجہ سے خلافت کی اہلیت باقی نہ رہے تو اس کا ایک خاص شرعی طریق کار ہے، جبکہ جمہوریت میں ایک خاص مدت کے لیے انتخاب کیا جاتا ہے جس کے بعد وہ چاہے نہ چاہے، بہرحال معزول ہو ہی جاتا ہے۔

انتخاب کے بعد:

۴......انتخاب کے بعد ”امیر“ یا ”وزیر“ جمہوریہ کی ذمہ داریاں بھی مختلف اور بالکل مختلف ہیں،

اسلامی نظامِ حکومت کا امیر اس بات کا پابند ہے کہ کسی بھی فیصلہ سے پہلے اس کو قرآن وسنت کے ترازو میں تولے، قابل مشاورت امور میں اہل حق وعقد کے شوریٰ سے مشاورت کرے اور اس کے بعد زیر بحث حادثہ میں قرآن وسنت کے دائرہ میں رہتے ہوئے جو پہلو اس کو ملک وملت کے حق میں زیادہ مفید معلوم ہو اس پر عمل درآمد کرے، اس کے برعکس رئیس جمہوریہ کا کام یہ ہے کہ کسی بھی اہم فیصلہ کرنے سے پہلے پارلیمنٹ میں اس کو پیش کرے، اراکین پارلیمنٹ اس پر کھل کر بحث ومباحثہ کریں گے اور اس کے نتیجہ میں جس طرف اکثر اراکین کی رائے ہو اسی کو اختیار کرنا ہوگا، اس میں نہ قرآن وسنت کے دائرہ کار میں رہنے کی ضرورت ہے نہ ہی وزیر اعظم کے ذاتی رائے کا اعتبار ہے جبکہ اکثریت کی رائے اس کے برخلاف ہو۔

شوریٰ اور پارلیمنٹ میں فرق:

اسلامی نظام حکومت کے شوریٰ اور جمہوری طرز حکومت کے پارلیمنٹ میں بحث ومباحثہ کا طریقہ کار، بظاہر دونوں چیزیں ایک جیسی لگتی ہیں کہ وہاں بھی اجتماعی رائے لے کر کوئی فیصلہ کیا جاتا ہے اور جمہوریت میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے، اس ظاہری مشابہت کو دیکھتے ہوئے ماضی قریب میں بھی اور معاصرین میں سے بھی بہت سے لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور وہ پارلیمنٹ کو اسلامی نظام حکومت کی شوریٰ یا اس جیسا قرار دیتے ہیں، فاضل مؤلف بھی اس غلط فہمی میں مبتلا نظر آتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں ایک چیز نہیں ہے بلکہ دونوں کے درمیان تضاد کی نسبت ہے کیونکہ:

الف:......شوریٰ میں جن اہل حل وعقد کی رائے لی جاتی ہے ان کا انتخاب صرف عقل مندی اور تجربہ کاری وغیرہ عناصر کی بناء پر نہیں ہوتا بلکہ ایمان وتقویٰ کے ترازو سے بھی ان کو تولا جاتا ہے، جبکہ ارکان پارلیمنٹ کے انتخاب کے لیے یہ کوئی ضروری نہیں ہے بلکہ عموماً دنیادار، سرمایہ کار اور ظالم وجاگیردار قسم کے لوگ ہی اس لیلیٰ مقصود تک پہنچ پاتے ہیں۔

ب:......ارکان شوریٰ رائے دہی میں آزاد نہیں ہوتے بلکہ قرآن وسنت کے مقرر کردہ حدود کے پابند ہوتے ہیں اور اسی دائرہ میں رہتے ہوئے وہ کوئی مشورہ دے سکتے ہیں، جبکہ پارلیمنٹ کے اراکین اس بات کے مطلق پابند نہیں ہوتے، زیادہ سے زیادہ اگر وہ کسی چیز کے پابند کہلائے جاسکتے ہیں تو ملکی آئین وقانون ہے، جس کی بالادستی کا حلف لے کر وہ پارلیمنٹ پہنچ پاتے ہیں، لیکن بعض صورتوں میں وہ خود آئین وقانون کو بھی تبدیل کرسکتے ہیں، چنانچہ ہمارے ہاں ملک پاکستان میں دوتہائی اکثریت کی رائے پر آئین میں بھی ترمیم کی جاسکتی ہے۔

ج:......امیر وخلیفہ شوریٰ کی رائے کا ہر حال میں پابند نہیں ہوتا، چنانچہ بسا اوقات وہ شوریٰ کی رائے کو قرآن وسنت کے خلاف سمجھتا ہے یا اس کی بنسبت کسی دوسرے پہلو کو قرآن وسنت اور عوام کی مفاد

ومصلحت کے قریب تر سمجھتا ہے تو اسی کو اختیار کرلیتا ہے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منصبِ خلافت سنبھال لینے کے بعد جب منکرین زکوۃ کیخلاف جہاد وقتال کا فیصلہ کیا، اُس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سمیت تقریباً تمام ارکان شوریٰ کی رائے اس کے خلاف تھی اور وہ اس اہم نازک موقع پر منکرین زکوۃ کیخلاف جہاد کرنے کے حق میں نہ تھے، لیکن خلیفہ رسول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے گویا تن تنہا یہ فیصلہ کیا اور اس کا عذر یہ بیان فرمایا کہ میرے نزدیک یہ لوگ بھی دیگر مرتدین کی طرح مرتد ہیں جن کا حکم یہی ہے کہ اسلام قبول کریں یا ان سے قتال کیا جائے، اسی طرح مختلف مواقع پر حضرت ابوبکر صدیق وغیرہ خلفاء (رضی اللہ عنہم) نے شوریٰ کی اکثریت کی رائے کی پابندی نہیں کی۔

قرآن کریم میں آپ ﷺ کو ارشاد فرمایا گیا:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِين.[آل عمران:۱۵۹] ”کام میں ان سے مشورہ لیا کر پھر جب تو اس کام کا ارادہ کر چکا تو اللہ پر بھروسہ کر بیشک اللہ توکل کرنے والے لوگوں کو پسند کرتا ہے۔“

یہ تو اسلامی خلافت کے شوریٰ کی بات تھی، نظام جمہوریت میں رئیس جمہوریہ/ وزیر اعظم، اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلہ کرنے کا پابند ہوتا ہے، اگر اس کی ذاتی رائے جمہور ارکان کیخلاف بھی ہو تو بھی اس کی یہ اوقات نہیں ہے کہ اکثریت کی بات چھوڑ کر کوئی فیصلہ کر سکے۔

اکثریت کی رائے سے متعلق ایک اشکال کا جائزہ:

یہاں اعتراض کے طور پر یہ نکتہ اٹھایا جاسکتا ہے کہ ذاتی رائے یا کم افراد کی رائے کے مقابلہ میں زیادہ افراد کی رائے واقعی زیادہ لائق اعتناء ہونی چاہیے کیونکہ جب اس جانب افراد کی تعداد زیادہ ہے تو ضرور سوچ وفکر کے کچھ زاویے ضرور ایسے ہوں گے جن کی طرف دوسرے فریق کی ذہنی رسائی ہوئی ہوگی، لہٰذا اکثریت کی رائے کی پابندی کو جمہوریت کے عیوب ونقائص نہیں بلکہ فضائل وکمالات میں سے گردان لینا چاہیے۔

سرسری نظر میں یہ بات بڑی معقول اور وزنی ظاہر ہوتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بات ہے بالکل بے وقعت، اکثریت کو نہ عقلاً کسی چیز کی حقانیت/صداقت پہچاننے کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے نہ ہی شریعت کی روشنی میں یہ کوئی معیار حق وصدق ہے، تجربہ شاہد ہے کہ دنیا میں عموماً عقل مندوں کی بنسبت بے عقل وکم عقل لوگوں کی کثرت ہوتی ہے، اگر کہیں تکلف کر کر کے دنیاوی عقلمندوں کو یکجا جمع بھی کیا جائے تو بھی ان میں سے ایسے سلیم فطرت اور کامل عقل والے افراد کی تعداد کم ہی ہوتی ہے جن کے عقل وفکر کا آئینہ حرص ولالچ اور خوف ودباؤ کے داغ سے پاک ہو، اس لئے قرآن وسنت کے متعدد نصوص میں اس بات کی تعلیم دی گئی۔

سورۃ انعام میں ارشاد ہے: وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ إِنْ

يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ. [الأنعام:۱۱۶] ترجمہ: ’’اور اگر تو کہا مانے گا اکثر ان لوگوں کا جو دنیا میں ہیں تو تجھے اللہ کی راہ سے ہٹا دیں گے وہ تو اپنے خیال پر چلتے اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔‘‘

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اکثریت کی خواہ مخواہ دشمنی کی جائے اور ان کی رائے کو کوئی وقعت نہ دی جائے، نہیں ایسا نہیں، بلکہ بعض جگہوں پر اکثریت کی رائے کا ایک حد تک اعتبار بھی ہوتا ہے، فقہاء حنفیہ نے بھی کسی مسئلہ میں اختلاف کے وقت بعض صورتوں میں ایک وجہ ترجیح کے طور پر اکثریت کو ذکر فرمایا ہے، جس کو فاضل مؤلف نے تحریر فرمایا ہے، لیکن اس سے اکثریت پر مبنی جمہوری فلسفہ پر استدلال کرنا مخدوش ہے، کیونکہ وہاں فقہاء کرام کے درمیان کسی حادثہ کے شرعی حکم کے متعلق اختلاف تھا اور ظاہر ہے کہ فقہاء کا اختلاف اجتہادی نوعیت کا اختلاف ہوتا ہے جس میں ہر فریق قرآن وسنت کے نصوص میں اپنی استطاعت کے مطابق غور وفکر کر کے واقعی شرعی حکم تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے، اس لئے اصل حکم خداوندی کی طرف کسی مجتہد کی رسائی ہو سکے یا نہ، دونوں صورتوں میں اس کو اجر وثواب ملتا ہے، جبکہ پارلیمانی نظام میں ارکان پارلیمنٹ کا نہ یہ مقصود ہوتا ہے نہ ہی عموماً ان میں اس عظیم اور نازک کام کی لیاقت واستعداد ہوتی ہے۔

منافات کا معیار:

دو چیزوں میں تغایر ومنافات کی بڑی صورت یہی ہوتی ہے کہ دونوں کا مقصود اور طریق کار جدا جدا ہو، فقہی اور پارلیمانی اختلاف کی بھی آپس میں یہی نسبت ہے کہ دونوں کا مقصود وغایت بھی الگ الگ ہے اور طریقہ کار بھی مختلف، فقہی واجتہادی اختلاف کا مقصود اللہ تعالیٰ کے حکم تک رسائی ہے اور طریقہ کار یہ ہے کہ کسی بھی حادثہ پیش آنے کے بعد قرآن وسنت کے نصوص میں اس کا حل ڈھونڈا جائے، اگر مل جائے تو اس کو اختیار کیا جائے ورنہ اجماع امت کی روشنی میں اس کا جواب تلاش کیا جائے، اگر یہاں بھی کوئی جواب نہ مل سکے تو اس کے بعد ایک خاص علمی وعملی استعداد رکھنے والے افراد اجتہاد وقیاس کے ذریعہ اس حادثہ کا شرعی حکم معلوم کرنے کی کوشش کریں، جبکہ پارلیمانی اختلاف کا مقصود شرعی حکم تک پہنچنا نہیں ہے بلکہ ہر ہر پارٹی اپنے دستور ومفاد کی روشنی میں جس بات کو مناسب خیال کرتی ہے اس کو ثابت کرنا اور منظور کروانا مدنظر ہوتا ہے اور عملی طریقہ کار میں قرآن وسنت کی کوئی پابندی نہیں ہوتی بلکہ زیادہ سے زیادہ ملکی آئین کا لحاظ کرنا ہوتا ہے۔

مقصود اور طریقہ کار کے اس واضح وبدیہی تغایر وتضاد کے ہوتے ہوئے دونوں قسم کے اختلافات کو ایک جیسا سمجھنا اور پارلیمانی اختلاف کو فقہی اختلاف پر قیاس کرنا کسی طرح درست نہیں۔

قیام خلافت کے دلائل:

’’مسئلہ خلافت‘‘ علم کلام کی کتابوں کا مستقل مبحث ہے جہاں اس کا حکم، دلائل وغیرہ تفصیل کے ساتھ ذکر کئے جاتے ہیں، یہاں ان تمام مباحث کو بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ خلافت کے وجوب کے کچھ

دلائل کو اختصار کے ساتھ ذکر کرنا ہے، علامہ تفتازانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''مقاصد الطالبین'' میں متعدد دلائل ذکر فرمائے ہیں، یہاں اسی کی روشنی میں کچھ اضافہ کے ساتھ نمبروار کچھ دلائل ذکر کیے جاتے ہیں:

الف:......بہت سے احادیث مبارکہ میں متعدد اسالیب کے ساتھ اس بات کی تاکید کی گئی، مثلاً: بعض روایات میں ہے کہ جو شخص امام کی بیعت کئے ہوئے بغیر مرا تو وہ جاہلیت کی موت مرا، متعدد روایات میں حکام وامراء کے حکم ماننے کی تاکید کی گئی اور جائز امور میں ان کی اطاعت کو ضروری قرار دیا گیا، جس سے مجموعی طور پر یہی بات نکلتی ہے کہ نصب امام بھی واجب ہے اور پھر جائز امور میں اس کی اطاعت بھی ضروری ہے۔

ب:......اجماع امت: امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مسلمانوں پر کسی ایسے امیر/امام کا ہونا ضروری ہے جو ان کے درمیان شرعی احکام نافذ کرتا ہو، خود حضرات صحابہ کرام نے اس بات پر اتفاق کیا تھا اور اسی اہمیت اور وجوب کے پیش نظر حضور ﷺ کی رحلت فرمانے کے فوراً بعد آپ ﷺ کی تکفین وتدفین سے بھی پہلے اس اہم حکم کی تعمیل فرمائی۔

ج:......دین اسلام کے متعدد احکام اس نوعیت کے حامل ہیں کہ: ہیں تو وہ فرائض اور واجبات، لیکن حکومت کے بغیر اس کو پورا نہیں کیا جاسکتا، مثلاً حدود وقصاص وتعزیرات کا نفاذ، اسلامی سرحدات کی حفاظت، وغیرہ۔

د:......یوں تو ہر مصلحت کا حصول ضروری ہے نہ ہر ضرر سے بچنا لازم، لیکن ضابطہ کے لحاظ سے بعض مصالح کا حصول ضروری ہو جاتا ہے، یوں ہی بعض مضر چیزوں کا دفع کرنا بھی لازم ہوتا ہے، خلافت کے قیام کے ساتھ بھی ایسی ضروری نوعیت کے کچھ مصالح وابستہ ہیں جن کا حصول شریعت کی نظر میں ضروری ہے، یوں ہی اسی خلافت کے سائے تلے ہی بہت سے ایسے مضر عناصر وفتن سے بچا جاسکتا ہے جن سے بچنا شرعاً ضروری ہوتا ہے۔

ان جیسے دلائل کی وجہ سے سلف صالحین اور ان کے بعد کے ادوار کے تقریباً تمام اہل علم کا اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ خلافت کا قیام مسلمانوں کا اجتماعی فریضہ ہے اور علماء امت کا یہ اتفاق بجائے خود ایک مستقل دلیل ہے، ویسے تو امامت وخلافت کا مبحث، علم کلام اور شرعی سیاست، ہر ایک علم وفن کا مستقل موضوع رہا ہے اور دونوں موضوعات کے مصادر ومراجع میں خلافت وامامت سے متعلق اہم اہم مباحث پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ مذکور ہیں جس کی تفصیل کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہیں، یہاں آسانی کے لیے مشت از نمونہ خروار کے طور پر بعض عبارات ذکر کی جاتی ہیں۔

امام غزالی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

نظام أمر الدين مقصود لصاحب الشرع عليه السلام قطعاً، وهذه مقدمة قطعية لا يتصور النزاع فيها، ونضيف إليها مقدمة أخرى وهو أنه لا يحصل نظام الدين إلا بإمام مطاع فيحصل من المقدمتين صحة الدعوى وهو وجوب نصب الإمام......فبان أن السلطان ضروری فی نظام الدنيا، وقيام الدنيا ضروری فی نظام الدين، ونظام الدين ضروری فی الفوز بسعادة الآخرة وهو مقصود الأنبياء قطعاً، فكان وجوب نصب الإمام من ضروريات الشرع الذی لا سبيل إلى تركه فاعلم ذلك.[الاقتصاد فی الاعتقاد، الباب الثالث فی الامامة:۱۲۷]

ترجمہ: پہلا مقدمہ یہ ہے کہ دین کا نظام برقرار رکھنا شارع علیہ السلام کا مقصود ہے اس میں کوئی نزاع نہیں ہے۔دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ دین کا نظام تب ہی برقرار رکھا جا سکتا ہے جب ایک ایسا امام موجود ہو جس کی اطاعت کی جاتی ہو۔ان دو مقدموں سے ہمارا دعوی ثابت ہوتا ہے کہ امام کا مقرر کرنا ایک امرِ ضروری ہے۔لہٰذا یہ بات واضح ہوئی کہ دنیا کے نظام میں سلطان کا مقرر کرنا ضروری ہے، اور دین کے نظام کو برقرار رکھنے کے لیے دنیا کا نظام برقرار رکھنا ضروری ہے، اور آخرت کی سعادت حاصل کرنے کے لیے دین کے نظام کو برقرار رکھنا ضروری ہے اور یہ سعادتِ آخرت انبیائے کرام علیہم السلام کا مقصودِ اصلی ہے۔(اور چونکہ یہ تمام چیزیں تب ہی ممکن ہیں جب ایک ایسا امام موجود ہو جس کی اطاعت کی جاتی ہو) تو (اس سے معلوم ہوا کہ) امام کا مقرر کرنا ضروریاتِ دین میں سے ہے اور اس کے چھوڑنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

علامہ آمدی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

مذهب أهل الحق من الإسلاميين أن إقامة الإمام واتباعه فرض على المسلمين شرعا لا عقلا وذهب أكثر طوائف الشيعة إلى وجوب ذلك عقلا لا شرعا وذهب بعض القدرية والخوارج إلى أن ذلك ليس واجبا لا عقلا ولا شرعا ..قال أهل الحق الدليل القاطع على وجوب قيام الإمام واتباعه شرعا ما ثبت بالتواتر من إجماع المسلمين فی الصدر الأول بعد وفاة رسول الله صلى الله عليه وسلم على امتناع خلو الوقت عن خليفة وإمام.[غاية المرام فی علم الكلام، الطرف الأول فی وجوب الإماكة وما يتعلق بها:۳۶۴]

ترجمہ: اہلِ حق کا مذہب یہ ہے کہ امام کا مقرر کرنا اور اس کی اتباع کرنا مسلمانوں پر فرضِ شرعی ہے نہ کہ فرضِ عقلی۔اور اہلِ شیعہ کے اکثر جماعتوں کا مذہب یہ ہے کہ یہ فرضِ عقلی ہے نہ کہ فرضِ شرعی۔اور بعض قدریہ اور خوارج کا مذہب یہ ہے کہ امام کا مقرر کرنا نہ عقلاً ضروری ہے اور نہ شرعاً ضروری ہے۔اہلِ حق اپنی اس بات کی یہ دلیل دیتے ہیں کہ قرنِ اول میں رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہو چکا تھا کوئی ایسا وقت نہیں گزرنا چاہیے جس میں مسلمانوں کا امام اور خلیفہ نہ ہو۔

مشہور مؤرخ علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں:

ثمّ إنّ نصب الإمام واجب قد عرف وجوبه فی الشّرع بإجماع الصّحابة والتّابعين

لأنّ أصحاب رسول الله صلّى الله عليه وسلّم عند وفاته بادروا إلى بيعة أبى بكر رضى الله عنه وتسليم النّظر إليه فى أمورهم وكذا فى كلّ عصر من بعد ذلك ولم تترك النّاس فوضى فى عصر من الأعصار واستقرّ ذلكإجماعا دالا على وجوب نصب الإمام.[تاريخ ابن خلدون، مقدمه :۲۳۹/۱] **ترجمہ:''امام کا مقرر کرنا ضروری ہے اور اور اس کا ضروری ہونا اجماعِ صحابہ اور تابعین سے ثابت ہے۔ اور جب رسول اللہ ﷺ اس دارِ فانی سے کوچ فرما گئے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے اور ان کو اپنے امور کی نگرانی حوالہ کرنے میں جلدی کی۔ اور یہ بات بعد کے زمانے میں بھی چلتی رہی، لوگوں کو کسی بھی زمانے میں افراتفری میں منتشر نہیں چھوڑا گیا، الخ۔''**

علامہ کاسانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

نصب الإمام الأعظم فرض، بلا خلاف بين أهل الحق، ولا عبرة بخلاف بعض القدرية لإجماع الصحابة رضى الله عنهم على ذلك، ولمساس الحاجة إليه؛ لتقيد الأحكام، وإنصاف المظلوم من الظالم، وقطع المنازعات التى هى مادة الفساد، وغير ذلك من المصالح التى لا تقوم إلا بإمام.[بدائع الصنائع، كتاب آداب القاضى، ج:۷ر ص:۲]

ترجمہ: امام کا مقرر کرنا فرض ہے اور اس میں اہلِ حق کا کوئی اختلاف نہیں ہے، اور جو بعض قدریہ نے اختلاف کیا ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہو چکا ہے، نیز احکام کی پابندی کروانے کے لئے، مظلوم کو ظالم کے ظلم سے نجات دلانے کے لئے، اور ان منازعات کو ختم کرانے کے لئے جو فساد کی جڑ ہیں، امام کی تقرری کی طرف محتاج ہیں۔ اور اس کے علاوہ کئی مصالح ہیں جن کا حصول امام کے ساتھ ہی ممکن ہے۔

اجماعیات کے مسائل پر معاصرین کے ایک جماعت نے "موسوعة الاجماع فى الفقه الاسلامى" **کے نام سے ایک مفصل کتاب لکھی، اس میں ہے:**

أجمع سلف الأمة، وأهل السنة، وجمهور الطوائف الأخرى على أن نصب الإمام -أى توليته على الأمة- واجب على المسلمين شرعًا لا عقلًا فقط، ...قال ابن حزم: "اتفق جميع أهل السنة، وجميع المرجئة، وجميع الشيعة، وجميع الخوارج، على وجوب الإمامة، وأن الأمة واجب عليها الانقياد لإمام عادل، يقيم فيهم أحكام اللّٰه، ويسوسهم بأحكام الشريعة التى أتى بها رسولاللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم حاشا النجدات من الخوارج فإنهم قالوا لا يلزم الناس فرض الإمامة......وقول هذه الفرقة ساقط، يكفى من الرد عليه وإبطاله: إجماع كل من ذكرنا على بطلانه، والقرآن والسنة قد وردا بإيجاب الإمام". وقال القرطبى: "ولا خلاف فى وجوب ذلك بين الأمة ولا بين الأئمة، إلا ما رُوى عن الأصم، حيث كان عن الشريعة أصم، وكذلك كل من قال بقوله واتَّبعه على رأيه ومذهبه."

[موسوعة الإجماع فى الفقه الإسلامى:۵۷/۵]

ترجمہ: امت کے اسلاف، اہل السنۃ اور ان کے علاوہ دیگر جماعتوں کا اس بات پر اجماع کیا ہے کہ مسلمانوں پر امام کا مقرر کرنا صرف عقلاً ضروری نہیں ہے بلکہ شرعاً بھی ان پر لازم ہے۔ علامہ ابن حزمؒ فرماتے ہیں: اہلِ السنۃ، مرجئہ، شیعہ اور خوارج کے تمام فرقوں نے امامت کے وجوب پر اجماع کیا ہے۔ اور امت پر امامِ عادل کا اتباع لازم ہے جو ان میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کو قائم کرتا ہے اور مسلمانوں کی بنیاد اس شریعت پر بناتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں۔ اور اس بات میں خوارج میں سے نجدات اختلاف کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ: لوگوں پر امام کا مقرر کرنا ضروری نہیں ہے، اور اس فرقہ کے اس قول کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اس قول کے رد اور ابطال کے لیے امت کا اجماع کافی ہے۔ اور قرآن وسنت امام کے نصب کے بارے میں وارد ہیں۔ امامِ قرطبیؒ فرماتے ہیں: اور اس بات (یعنی امام کے مقرر کرنے کے بارے میں) نہ امت کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے اور نہ ہی ائمہ کے درمیان سوائے اصم کے جو کہ واقعۃً حق سے اصم (بہرا) تھا، اسی طرح جن لوگوں نے اس کے قول اور مذہب کو اختیار کیا۔

چند صفحات بعد نصب امام کا معنی اور اس کا حکم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

ونصب الإمام فی الاصطلاح: اختیار خلیفة للمسلمین نیابة عن صاحب الشریعة فی حفظ الدین وسیاسة الدنیا؛ لیقیم فیهم أحكام اللّٰه –تعالی–، ویسوسهم بأحكام الشریعة، وتجتمع به الكلمة، وتنفذ به أحكام الخلافة. وبهذا المعنی فإن نصب الإمام واجب بإجماع العلماء.[موسوعة الإجماع فی الفقه الإسلامی:۶۸/۵]

ترجمہ: امام نصب کرنے کا اصطلاحی معنی یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے ایک خلیفہ کا تعین کیا جائے اور یہ صاحبِ شریعت سے امورِ دین ودنیا کی حفاظت میں نیابت تصور ہوگا تاکہ خلیفہ ان مسلمانوں میں اللہ تعالیٰ کے احکامات قائم کرے اور ان کی بنیاد احکامِ شرعیہ پر بنائے اور تاکہ اس کے ساتھ مسلمانوں کے اقوال جمع ہوں اور اسی کے ذریعے خلافت کے احکام نافذ ہو جائیں۔ اور نصبِ امام کا جو معنی کیا گیا تو اس معنی کے اعتبار سے تمام علمائے کرامؒ کا اس بات پر اجماع ہے کہ نصبِ امام واجب ہے۔

ان عبارات سے بڑی وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ امامت وخلافت کا قیام ایک شرعی ذمہ داری ہے، اگرچہ اس بات میں اختلاف ہے کہ اس کا وجوب محض دلیل عقلی سے ثابت ہے یا نقلی دلائل سے، لیکن ہے واجب دونوں کے نزدیک، ابوبکر اصم وغیرہ جن لوگوں نے اس کو سرے سے واجب ہی نہیں کہا، قطع نظر کرتے ہوئے کہ درج بالا دلائل کے ہوتے ہوئے ان کے اختلاف کا اعتبار ہے یا نہیں؟ خود ان کی بات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ اختلافی موقف صرف نظریاتی حد تک واجب ہونے نہ ہونے میں ہے یا اپنے زعم کے مطابق کسی مصلحت کی بناء پر یہ اختلاف ان سے منقول ہے، عملی طور پر اس کے واجب ہونے میں کلام نہیں ہے۔

علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ اصم اور بعض خوارج کا خیال نقل کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک خلیفہ مقرر کرنا لازم نہیں، فرماتے ہیں:

”وقد شذ بعض الناس فقال بعدم وجوب نصب الخليفة رأسًا لا بالعقل ولا بالشرع، منهم الأصم منالمعتزلة وبعض الخوارج وغيرهم .والواجب عند هؤلاء إنما هو إمضاء أحكام الشرع فإذا تواطأت الأمة على العدل وتنفيذ أحكام الله تعالى لم تحتج إلى إمام ولا يجب نصبه .وهؤلاء محجوجون بالإجماع والذى حملهم على هذا المذهب إنما هو الفرار من الملك ومذاهبه من الاستطالة والتغلب والاستمتاع بالدّنيا لمّا رأوا الشّريعة ممتلئة بذمّ ذلك والنّعى على أهله ومرغّبة فى رفضه.“[تاريخ ابن خلدون، الفصل السادس والعشرون:۲۳۹/۱]

حاصل ترجمہ: اور بعض لوگوں نے امام کے مقرر کرنے سے متعلق یہ قول کیا ہے کہ خلیفہ مقرر کرنا سرے سے ضروری نہیں ہے، نہ عقلا اور نہ شرعا۔ ان میں معتزلہ میں سے اصم اور بعض خوارج شامل ہیں۔ اور ان لوگوں کے نزدیک شرع کے احکام کو جاری کرنا ضروری ہے تو جب امت عدل اور اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ کرنے پر متفق ہو جائیں تو امام کا مقرر کرنا ضروری نہیں ہے۔ اور ان کے خلاف اجماع دلیل ہے اور اس قول کو اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ بادشاہوں کی ناجائز حرکات سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔“

اس سے واضح ہوا کہ اسلامی نظام حکومت وخلافت کا قیام امت مسلمہ کے اجتماعی فرائض وواجبات میں سے ایک ہے اور یہ دیگر فرائض کی طرح ایک عام واجب ہی نہیں ہے بلکہ دسیوں نوعیت کے واجبات اسی ایک فریضہ کے ساتھ متعلق ہیں جن کا کما حقہ پورا کرنا خلافت کا سہارے لئے بغیر بڑا مشکل ہے، اس لئے عام واجبات کی بنسبت یہ ایک غیر معمولی اہمیت کا حامل اور بنیادی فریضہ ہے جس میں کوتاہی کرنا کسی طرح روا نہیں ہے، حضرات صحابہ کرام کے طرز عمل سے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضور ﷺ کے انتقال فرمانے جیسے جانکاہ حادثہ کے فوراً بعد جو الم وغم کا سماں تھا، اس انتہائی درد وکرب کے عالم میں بھی اس ذمہ داری کے نبھانے میں تاخیر سے کام نہیں لیا حتیٰ کہ حضور ﷺ کی تکفین وتدفین پر بھی اس کام کو مقدم رکھا۔

مغربی طاقتوں کے حربے:

اسلام دشمن طاقتوں سے یہ راز پوشیدہ نہیں ہے کہ یہی قیام خلافت ہی ایک ایسی چھتری ہے جس کے سائے تلے امت مسلمہ یکجا اور ہم فکر وہم نوالہ رہ سکتی ہیں، اور اسی سایہ عاطفت میں ابناء اسلام کی تنظیم وتربیت ہوتی ہے اس لئے انہوں نے اسی فریضہ کیخلاف سیف وسنان کی دشوار گزار راستہ اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ فکری جنگ میں بھی بھرپور حصہ لیا اور اس بات کی سرتوڑ کوشش کی بلکہ ان کی محنت کا تسلسل آج تک جاری ہے کہ اس فریضہ کے فریضہ ہونے کا احساس ہی امت کے دلوں سے رخصت ہو جائے، جب دل ودماغ سے اس کا احساس جاتا رہے گا تو اس کے بعد اس کے لئے محنت کرنے اور جان کھپانے کا کیا معنیٰ؟

اس کام کے لیے ابناءِ اسلام ہی میں سے کچھ افراد سے (دانستہ یا نا دانستہ طور پر) ان کو بیش بہا فائدہ حاصل ہوا جنہوں نے اسلام کے طریقہ سیاست وخلافت کیخلاف کوئی علمی/تحریری یا تقریری کام کیا، اس کی بڑی مثال مصر کے شیخ علی عبدالرزاق ہیں، جنہوں نے ایک عرصہ پہلے ''الاسلام واصول الحکم'' کے نام سے کتاب لکھ کر یہی بات ثابت کرنے پر زورصرف کیا کہ حکومت وخلافت شریعت کی نظر میں کوئی ضروری ولازم نہیں ہے اور اسلام نے کہیں خلافت نافذ کرنے کا حکم نہیں دیا، اس کتاب کی بدولت مصر کے علمی ودینی وسیاسی حلقہ میں اضطراب وبے چینی کی کیفیت پیدا ہوگئی، وطن عزیز پاکستان میں چندسال پہلے جناب جاوید احمد غامدی نے روزنامہ جنگ میں ''اسلام اور ریاست، ایک جواب بیانیہ'' کے نام سے ایک کالم لکھا جس کا حاصل یہی تھا کہ ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور مسلمانوں پر شریعت کی طرف سے یہ کوئی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ زمین میں اسلامی خلافت کا نظام قائم کریں، زیرنظر کتاب سے بھی ایک عام قاری کو یہ تاثر ملتا ہے کہ جمہوریت اسلامی نظام حکومت کی ترقی یافتہ، قابل عمل اور مفید شکل ہے۔

ان جیسے دانش مندوں میں سے جو کچھ دینی فکر وغم کی نعمت سے آشنا ہو یا قارئین کے جذبات واحساس کا لحاظ رکھتے ہوئے نفاذ اسلام کے پہلو پر بھی توجہ مرکوز رکھتے ہیں تو وہ یہی تجویز دیتے ہیں کہ جمہوریت کے دائرہ میں رہتے ہوئے ہی نفاذ اسلام کی کوشش کی جائے اور اس مدعٰی کے لیے وہ آزادی اظہار رائے، مساوات اور جمہوریت کے دیگر فضائل ومناقب کا ورد کرنا شروع فرماتے ہیں کہ یہ فضائل کسی نظام حکومت میں موجود ہیں نہ ہی اس کے بغیر کوئی نظام حکومت قائم رہ سکتا ہے۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر جمہوریت کی ماہیت وحقیقت اور اس کی تاریخ واثرات پر ٹھنڈے دل اور روشن دماغ کے ساتھ غور کیا جائے تو یہی واضح ہوتا ہے کہ یہ نظام حکمرانی وادی تیہ کی عملی تصویر اور اسی کی ترقی یافتہ شکل ہے جس کو انہی لوگوں نے دنیا میں رائج کیا ہے جو خود وادی تیہ کی زندگی کا تجربہ کر چکے ہیں، اسلامی دنیا کی مختلف جمہوری حکومتوں کے احوال سے واقفیت رکھنے والوں کے لیے اَب یہ بات مخفی نہیں رہی کہ مساوات وحریت وغیرہ جن جمہوری اَقدار کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے وہ تبھی ہے جبکہ اس میں اسلام اور اسلامی قانون کی آمیزش نہ ہو، جہاں اس فلسفہ کے سہارے کسی واقعی اسلامی نظمِ حکومت کے قیام تک رسائی ہوجائے وہاں طاقت وسازش کے زور سے ایسے مذہبی عناصر کو کچل دینا لازم ہوجاتا ہے۔

ہم کسی پر بلا وجہ کوئی بدگمانی نہیں کرتے بلکہ یہی خیال کرتے ہیں کہ مسلمان نیک نیتی کے ساتھ ہی کوئی دینی کام کرتا ہے، خصوصاً اہل علم جب کسی موضوع پر بحث ومباحثہ کا آغاز کرتے ہیں تو خدمت دین اور رضائے خداوندی کا جذبہ ہی کارفرما ہوگا، تاہم اس بات سے بھی پہلوتہی نہیں کی جاسکتی کہ بحث ومباحثہ کا بھی کوئی دائرہ کار اور طریقہ کار ہونا ضروری ہے، امت مرحومہ کی موجودہ افسوس ناک حالات میں اجماعی

نوعیت کے مسائل کو ''مباحثہ ومکالمہ'' کا موضوع بنانے کی آخر ضرورت کیا ہے؟ اور پھر اگر انہی مسائل کو موضوع بحث بنانے کی ضرورت ہو تو بھی سرسری مطالعہ اور سطحی دلائل کے بل بوتے پر اتفاقی مسائل کو تختہ مشق بنا کر ایسی صورت میں پیش کردینے کا کیا جواز ہوسکتا ہے جس سے قاری تردد وتذبذب کا شکار ہو کر رہ جائے؟

ایک جدید اشکال کا جواب:

فریضہ خلافت کے متعلق بعض حلقوں کی جانب سے ایک اشکال بڑے زور وشور سے اُٹھایا جاتا ہے کہ حدود وقصاص وغیرہ جتنے واجبات خلافت وحکومت حاصل کرنے کے ساتھ وابستہ اور اس پر موقوف ہیں، ان کی ذمہ داری امت پر ابھی عائد ہی نہیں ہوتی، لہٰذا ان واجبات کی تکمیل وتعمیل کے لیے قیام خلافت کو کیونکر فرض یا واجب قرار دیا جاسکتا ہے؟ مثال کے طور پر صاحب نصاب شخص پر اپنے مال کا کچھ حصہ بطورِ زکوۃ دیدینا فرض ہے لیکن فرضیت کا یہ حکم تب ہی متوجہ ہوگا جبکہ کوئی شخص عملی طور پر صاحب نصاب ہو، خاص اس فریضہ کو پورا کرنے کے لیے نصاب کے بقدر مال حاصل کرنا ضروری نہیں ہے۔

لیکن اس اشکال کی حیثیت ایک سطحی شبہ سے زیادہ نہیں ہے، کیونکہ اس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ:

۱۔ شریعت نے خود خلافت کے قیام کا حکم نہیں دیا، صرف ان چند واجبات کا حکم دیا ہے جو قیام خلافت کے بعد مسلمانوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

۲۔ ان واجبات کو بھی حتمی طور پر واجب قرار نہیں دیا گیا بلکہ خلافت پر موقوف چھوڑ دیا گیا کہ اگر آپ لوگوں کی جھولی میں خلافت کی چابی نازل ہوگئی تو اس کے بعد ان واجبات کا لحاظ رکھنا۔

جبکہ یہ دونوں مفروضے غلط ہیں، خلافت قائم کرنا گو شرعاً مقصود اصلی نہیں ہے لیکن کئی واجبات وفرائض کے اس پر موقوف ہونے کی وجہ سے مستقل فریضہ ہے جس کی دلیل ایک تو وہ نصوص ہیں جن میں اقامت دین کا حکم دیا گیا، چونکہ پورے دین کی اقامت خلافت کے بغیر شرعاً ممکن ہے نہ عقلاً کہیں ایسا واقع ہوا، اس لئے خود خلافت کا قیام بھی لازم ہے۔ دوسری بڑی دلیل وہ نصوص ہیں جو اس باب میں صریح ہیں، مثلاً صحیح مسلم میں حضرت نافع سے روایت ہے کہ یزید کے دورِ حکومت میں جب واقعہ حرہ کا افسوس ناک حادثہ واقع ہوا، تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن مطیع کے پاس گئے اور ان سے عرض کیا:

إني لم آتك لأجلس، أتيتك لأحدثك حديثا سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقوله: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: ”من خلع يدا من طاعة، لقى الله يوم القيامة لا حجة له، ومن مات وليس فى عنقه بيعة، مات ميتة جاهلية.“ [صحيح مسلم، باب الأمر بلزوم الجماعة عند ظهور الفتن وتحذير الدعاة إلى الكفر] ترجمہ: میں بیٹھنے کے لیے آپ کے پاس نہیں آیا بلکہ اس لئے آیا تاکہ اس کو حدیث سناؤں، میں نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''جو شخص

(امام کی) اطاعت سے ہاتھ کھینچے وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس حال میں ملے گا کہ اس کے پاس کوئی حجت نہیں ہوگی اور جو شخص اس حال میں مرے کہ اس کی گردن میں (کسی امام کی) کوئی بیعت نہ ہو تو وہ جاہلیت کے موت مرا۔"

اس روایت کا دوسرا حصہ اس باب میں بالکل صریح ہے کہ جو شخص کسی امام کی بیعت کے بغیر مرا وہ جاہلیت کی موت مرا، اُصولی طور پر کسی متعین چیز کو جاہلیت کی چیز قرار دینا اس کی مذمت وممانعت کی دلیل ہوتی ہے کیونکہ جاہلیت اسلام کی ایسی ضد ہے جس کے مٹانے کے لیے اسلام کا سورج طلوع ہوا۔

(حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما تو اسلام کے نظام خلافت سے وابستہ رہنے کے لیے یزید جیسے فاسق کی بیعت توڑنا بھی پسند نہیں فرما رہے، چہ جائے کہ ان لوگوں کا قول جن کے نزدیک خلافت کا قائم ہونا سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا۔ یاد رہے کہ جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یزید کے خلاف خروج فرمایا تھا، ان کا مقصود بھی نظام خلافت کی اصلاح ہی تھا، نہ کہ نظام خلافت کو موقوف کرنا۔)

اس کے علاوہ حضرات صحابہ کرام اور سلف صالحین کا علمی وعملی طور پر اجماع واتفاق بھی اس بات کی دلیل ہے کہ قیام خلافت ایک مستقل فریضہ ہے جو امت کے کندھوں پر عائد ہوتا ہے۔

وہی پرانی بات:

اگر اس اشکال پر غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ یہ درحقیقت وہی اشکال ہے جس کی بنیاد پر خوارج میں سے بعض فرقوں نے بہت پہلے ہی اجماع امت کی مخالفت کر کے نصبِ امام کے واجب ہونے سے انکار کیا تھا، خوارج کی اُس دلیل اور اس معاصر استدلال کے درمیان اگر کچھ فرق ہے تو یہی کہ خوارج کی وہ پرانی دلیل، اس جدید اشکال واستدلال کی بنسبت زیادہ دقت ودیانت پر مبنی ہے کیونکہ اس قدیم دلیل میں صرف حدود وقصاص وغیرہ واجبات ہی کو مدنظر نہیں رکھا گیا جو قیام خلافت کے بعد متوجہ ہوتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عدل وانصاف کے قیام کو بھی ایک واجب قرار دیا گیا، لیکن ان تمام باتوں کو ضروری خیال کرنے کے باوجود اس کے لیے خاص خلافت کے قیام کو غیر ضروری قرار دیا۔

علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ ان خوارج کا قول نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"وقد شذ بعض الناس فقال بعدم وجوب نصب الخليفة رأسًا لا بالعقل ولا بالشرع، منهم الأصم من المعتزلة وبعض الخوارج وغيرهم. والواجب عند هؤلاء إنما هو إمضاء أحكام الشرع فإذا تواطأت الأمة على العدل وتنفيذ أحكام الله تعالى لم تحتج إلى إمام ولا يجب نصبه."[تاريخ ابن خلدون، الفصل السادس والعشرون:۲۳۹/۱]

حاصلِ ترجمہ: "بعض لوگوں نے امام مقرر کرنے کے بارے میں یہ قول کیا ہے کہ خلیفہ مقرر کرنا

سرے سے ضروری نہیں ہے، نہ عقلاً اور نہ شرعاً۔ ان میں معتزلہ میں سے اصم اور بعض خوارج شامل ہیں۔ اور ان لوگوں کے نزدیک شرع کے احکام کو جاری کرنا ضروری ہے، تو جب امت عدل اور اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ کرنے پر متفق ہو جائیں تو امام کا مقرر کرنا ضروری نہیں ہے۔‘‘

اس کو حسنِ اتفاق کہئے یا پرانے ماہرین کے نئے جال سے تعبیر کریں لیکن تجربہ یہ ہے کہ اتفاقی نوعیت کے مسائل واحکام میں کتر وبیونت کے لیے جس قدر دلائل واشکالات کے انبار لگائے جاتے ہیں، عام طور پر ان دلائل کا کوئی نہ کوئی سرا اُن مباحث ودلائل سے جا ملتا ہے جو مختلف فرقوں اور تاریک فتنوں کی حامل جماعتوں کے حوالہ سے ہماری دینی کتب کے ذخیرہ میں موجود ہیں جن کو ایک بار امت کا اجتماعی ضمیر رد کر چکا ہے اور جن کی بدولت امت ایک بار افتراق وانتشار کا مزہ چکھ چکی ہوتی ہے لیکن، کوئی چاہے تو اس کو زاویہ فکر ونگاہ کی تبدیلی کہے یا مزاج ومذاق کا فرق کہ، انہی دلائل میں نئے حالات ومصالح کے مطابق روح پھونک کر ایک بار پھر بیچاری امت مرحومہ کو اختلاف وتشتت کے عذاب میں ڈالا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس بیچاری ومظلوم امت مسلمہ کو خلافت وسیادت کی عزت ومقام سے بہرہ ور فرمائے۔

وفیات

......تلمیذ حضرت مدنیؒ حضرت مولانا محمد ادریس رحمہ اللہ [مانسہرہ]

......مولانا مفتی ابولبابہ شاہ منصور مدظلہم کے والد گرامی سعید شاہ رحمہ اللہ

......معروف بزرگ نعت خوان حافظ محمد شریف منچن آبادی رحمہ اللہ

......مولانا طاہر فیاض کے والد محترم رحمہ اللہ [جلال پور پیر والہ ضلع ملتان]

......مولانا مفتی احمد الرحمٰن رحمہ اللہ کے نواسے رحمہ اللہ [کراچی]

......خطاط نویس مولانا قاری محمد اقبال رحیمی رحمہ اللہ [ملتان]

......مولانا مفتی سمیع اللہ صاحب کے والد گرامی رحمہ اللہ [کوئٹہ]

...... سید علاء الدین شاہ ؒ کے خلیفہ حضرت صوفی عطاء اللہ نقشبندی رحمہ اللہ [گوجرانوالہ]

......معروف عالم دین، مذہبی سکالر علامہ ارشد حسن ثاقب رحمہ اللہ [لاہور]

......نسیم اور علی گل کے ماموں رحمہ اللہ [سندھ]

......مولانا حفیظ الرحمٰن کی والدہ محترمہ رحمہا اللہ [احمد پور شرقیہ]

......مولانا مفتی حسین احمد صاحب کے والد گرامی رحمہ اللہ

......محمد فاروق صاحب کی ہمشیرہ محترمہ رحمہا اللہ [جلال پور جٹاں، گجرات]

قارئین سے مرحومین کے لیے مغفرت اور پسماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کی درخواست ہے۔

فضیل احمد ناصری

بیعت کا مقصد ''اصلاحِ نفس'' ہے، یا ''حصولِ خلافت''؟

بیعت کا لفظ ''بیع'' سے نکلا ہے، جس کا معنیٰ ہے: ''فروخت کر دینا''۔ شے کو اپنی ملکیت سے نکال دینا۔ بیعت میں بھی یہ معنیٰ ملحوظ ہے۔ ایک شخص کسی دوسرے کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیتا ہے تو ہاتھ دینے والے کو مرید اور ہاتھ تھامنے والے کو ''شیخ'' کہتے ہیں۔ جب کہ جانبین کا یہ عمل ''بیعت'' کہلاتا ہے۔ یہ اصلاحِ نفس کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ بیعت کی کئی قسمیں اہلِ علم کے یہاں منقول ہیں، مثلاً: بیعتِ جہاد اور بیعتِ اصلاحِ نفس وغیرہ۔ بیعت کا ثبوت قرآن وحدیث سب سے ہے۔ الحمدللہ بیعت کا سلسلہ نقلاً بعد نقل ہم تک پہنچ چکا ہے۔ آج کل جو بھی بیعتیں ہو رہی ہیں ان کا عنوان ''اصلاحِ قلب'' اور تزکیۂ نفس ہے۔

یہ عمل بے حد مبارک، مسعود، قابلِ رشک اور روح پرور ہے۔ جو لوگ اس سلسلے سے وابستہ ہیں، بڑے مبارک ہیں۔ بڑے بڑے اولیاء اللہ اسی راستے سے ''معرفت یاب'' ہوے۔ لاکھوں، کروڑوں کی اصلاح ہوئی۔ لوگوں کے مردہ دل زندہ ہو گئے۔ جن کے معاملات اور اخلاق درست نہ تھے، ان کی زندگی ''حیاتِ طیبہ'' میں تبدیل ہو گئی۔ عبادات میں کورے اس مبارک سلسلے سے جڑتے ہی زاہدِ پاکباز بن گئے۔ غرض یہ کہ بیعت وارشاد سے وابستگی نے عظیم الشان اور تاریخی انقلاب برپا کیا۔

مگر: ہر کمالے را زوالے۔ ہر عمل کی طرح اس میں بھی فتور پیدا ہو گیا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اب اس میں بھی کوتاہیاں راہ پا چکی ہیں۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ ''بیعت وارادت'' ایک بزنس بن گئی ہے۔ لوگ خانقاہوں کا رخ ''اصلاحِ نفس'' کے بجائے ''حصولِ خلافت'' کے لیے کر رہے ہیں، چناں چہ ایک شخص آج بیعت کرتا ہے اور چند دنوں کے بعد خلافت اینٹھ لاتا ہے۔ اور پھر بقلمِ خود اپنے نام کے ساتھ خلیفہ ومجاز لکھنا فرض وواجب سمجھتا ہے۔ میں ایسے درجنوں پیروں کو جانتا ہوں جن کے روز وشب (قصدی و عادی) گناہوں سے آلودہ ہیں، مگر وہ ہیں خلیفہ ومجاز۔ اور دھڑلے سے مجلسِ بیعت بھی برپا کر رہے ہیں۔ جب وہ خود ایسے ہوں تو دوسروں کی اصلاح کیوں کر ممکن ہے؟ چناں چہ عام مشاہدہ ہے کہ ایسے پیروں کے خلفا ایسے عیوب میں پختہ ہوتے ہیں، جن سے پاک رہنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔ خلفا کی حرکات وسکنات کو دیکھ کر پیرِ مغاں کے ''جغرافیے'' کا اندازہ لگانا کچھ بھی مشکل نہیں...... **تعرف الشجرة باثمارها** ......ایسے

خلفا کو دیکھ کر بعضے تو یہ تبصرے بھی کر جاتے ہیں کہ میاں! یہ خلافت لے کر آیا ہے، یا کھلی آفت؟ ایسے خلفا کی افزائش نے خانقاہوں کے تابناک کردار کو دھندلا کر دیا ہے۔

الحمدللہ ملک (ہندوستان) میں اچھے مرشدوں کی اَب بھی کوئی کمی نہیں، مگر وہ گوشۂ گمنامی کو ترجیح دینے کی بنا پر منظرنامے سے اوجھل ہیں۔ بہار میں ''حضرت الحاج مولانا حافظ شمس الھدیٰ صاحب دامت برکاتہم'' بڑے اچھے مرشد ہیں۔ ان کے یہاں خلافت بس برائے نام ہے۔ میرے بڑے بہنوئی سہیل احمد ناصری صاحب کم وبیش تیس برسوں سے مرید ہیں۔ بے حد متدین۔ کمالِ اخلاق۔ معیاری مسلمان، مگر انہیں ہنوز خلافت نہ مل سکی۔ وہی کیا، ان کے دو تین ساتھی کے سوا کوئی بھی اسے حاصل نہ کر سکا۔ وہ اپنے مریدین کو خوب رگڑتے ہیں۔ نفس کشی اور تزکیے پر ہمہ تن زور ہے۔ اگر وہ دکان دار پیر ہوتے تو ان کے خلفا کی لائن لگی ہوتی، جیسا کہ عام پیروں کا دیکھا جا رہا ہے۔

بعض لوگوں کے بارے میں میں نے سنا کہ وہ بیعت کرتے ہی ''خلافت'' بھی تھما دیتے ہیں۔ بیعت و ارشاد کو عجیب مضحکہ خیز بنا رکھا ہے۔ بعض لوگوں کو دیکھا کہ اپنے اسفار کے دوران جس پیر کو ''علاقے'' کا مشہور ومقبول پاتے ہیں، ان سے بیعت کر کے اور دو چار فرضی منامات سنا کر، نیز شیخ کو بھاری لفافہ تھما کر خلافت کھینچ لاتے ہیں، چناں چہ ایک ہی شخص بیک وقت کئی کئی شیوخ کا خلیفہ ہوتا ہے۔ میں ایسے کئی امبانی العلما واڈانی العلما کو جانتا ہوں، جنھوں نے پیری مریدی کو ایک کھلونا بنا کر رکھ دیا ہے۔ حضرت تھانوی اپنے کسی خلیفہ میں کوئی جھول پاتے تو فوراً خلافت چھین لیتے۔ ماضی قریب میں معروف عالم کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ حضرت مولانا شاہ حکیم اختر صاحب نے ان کی تصویر کشی کی وجہ سے خلافت چھین لی تھی ......آہ! اب ایسے شیوخ بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملتے اور جو ملتے ہیں وہ بھی ان رذائل میں بری طرح ملوث ہیں، جن کی قباحت وشناعت سے قرآن وسنت مملو ہے......!!

(اِن سطور کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ بیعت وسلوک سے کنارہ کشی کر لی جائے، بلکہ کھرے کھوٹے کی پہچان ضروری ہے۔ صحیح العقیدہ، متبع سنت، بدعات ورسومات سے دُور رہنے اور خواہشِ نام ونمود، دنیاوی طمع و لالچ سے پاک مشائخ عظام کا انتخاب کرنا چاہیے نہ کہ اُن کا جن کے ہاں: ''جھٹ بیعت پٹ خلافت'' کا رواج ہے۔ اکابر اہل سنت دیوبند کے مسلک ومشرب پر مضبوطی سے قائم رہنے والے صلحاء آج بھی موجود ہیں، جن کے ہاں نہ تو خلافت ملنے کی کوئی ضمانت ہے نہ مریدین کے علاقہ میں اُن کی تعریفات کے پل باندھنے کی۔ البتہ اصلاح اور تزکیہ نفس ضرور ہے۔ اگر تزکیہ نفس مطلوب ہے تو ایسوں کو تلاش کیجیے!

☆......☆......☆......☆

مولانا نور محمد آصف، ٹمن

مکتوب بنام مولانا حفیظ اللہ صاحب

مؤلف ''مجالس ذکر اللہ کے خلاف سازشیں''

نَحْمَدُهٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْم

مکرمی جناب حضرت مولانا حفیظ اللہ صاحب زید مجد ہم   السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ احقر نے حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب چاریاری مدظلہ کی کتاب ''مجالس ذکر اللہ کے نام پر علمائے دیوبند کے خلاف سازشیں'' کا مطالعہ کیا تو دل میں طلب پیدا ہوئی کہ آپ کی کتاب جس کا یہ جواب ہے۔ یہ بھی مطالعہ کروں۔ چنانچہ اس کے دونوں ایڈیشن منگوائے اور ان کا مطالعہ کیا۔ دوبارہ مولانا عبدالرحیم کی کتاب کا مطالعہ کیا۔ اصلاح احوال کی خاطر چند گزارشات پیش کر رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ ان پر ضرور غور فرمائیں گے اور غلطی کی اصلاح فرمائیں گے۔

نمبر ا:......سب سے پہلے مجھے کتاب کا نام پڑھ کر تعجب ہوا کہ آپ نے نام رکھا ہے: ''مجالس ذکر اللہ کے خلاف سازشیں'' حالاں کہ آپ کے مخالفین صرف سنت کے خلاف ایسی مجلس ذکر اللہ کے خلاف ہیں جو کہ بدعتی طریقہ پر ہوں، جیسا کہ آپ کے دادا پیر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے فرمایا کہ:

''اس کا لحاظ ضروری ہے کہ بدعتی صورت پیدا نہ ہو۔ ایک حلقے میں سب کا ذکر نہ ہو علیحدہ علیحدہ نشستیں کریں۔ ایک نشست یعنی بالکل اجتماعی صورت یہاں بھی نہ ہو۔''

تو آپ کے مخالفین مطلقاً مجالس ذکر کے تو خلاف نہیں، تو پھر ''مجالس ذکر اللہ کے خلاف سازشیں'' نام رکھنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ جب کہ ان حضرات نے شرعی اور فقہی دلائل کی بناء پر ان مجالس ذکر کو ناجائز قرار دیا ہے، جن میں بڑے بڑے اصحاب علم وفقہ اور اصحابِ طریقت، علماء و مشائخ شامل ہیں۔ مولانا عبدالرحیم چاریاری کی کتاب کے باب نمبر ۶ رکا نام ''مروجہ مجالس ذکر و درود کی شرعی حیثیت'' ہے۔ آپ نے اس کا نام ''مجالس ذکر اللہ اور ذکر بالجہر بدعت'' نقل کیا ہے، حالاں کہ یہ ان کے کسی باب کا نام نہیں۔ اپنی طرف سے ایک بات بنا کر دوسرے کے ذمہ لگا دینا مناسب نہیں، اس سے آپ کو رجوع و معذرت کرنی چاہیے۔

نمبر ۲:......تقریظ لکھنے والے بزرگوں پر آپ نے بلا پڑھے، بلا سوچے مولانا عبدالرحیم کی خدمات کو سراہنے اور ان کی تائید کا الزام لگا دیا ہے۔ بلکہ گناہ کبیرہ میں شمولیت کے مترادف تک لکھ دیا ہے، لیکن آپ نے اس گناہ کی نشاندہی نہیں فرمائی۔ اور ان پر بلا تحقیق، ظن بلکہ وہم کی بنیاد پر کبیرہ گناہ میں شمولیت کا مجرم ٹھہرا

دینا کیا یہ اِنَّ بَعۡضَ الظَّنِّ اِثۡمٌ .اور گناہ کبیرہ کی فہرست میں نہیں آتا؟

ہمارا تو ان بزرگوں پر اعتماد ہے کہ انہوں نے مطالعہ کر کے شرعاً صحیح بات کی تائید فرمائی ہے۔آپ نے ان بزرگوں پر اکابر کے مقابلے میں آنے کا الزام عائد کیا ہے، حالاں کہ یہ حضرات تو اکابر کی تحقیق کو آگے پہنچا رہے ہیں۔آپ نے تو ہمارے شیخ حضرت شیخ الحدیث مولانا حبیب الرحمٰن سومرو دامت برکاتہم پر مماتیوں کی ہم نوائی کا الزام بھی لگا دیا ہے کہ: اصل انسان روح کو فرمایا، جس کی وضاحت حضرت شیخ مدظلہم العالی نے حافظ عبدالوحید حنفی کے نام مکتوب میں فرما دی ہے کہ جسم سواری ہے اور روح سوار ہے۔تو ظاہر ہے اصل سوار ہوتا ہے اور وعدہ الست کس سے کیا، جب جسد عنصری تھا ہی نہیں؟ آپ نے اپنی طرف سے اس عبارت کو عذاب وثواب سے جا جوڑا ہے، یہ کتنی بددیانتی ہے۔آپ تو ماشاءاللہ اہل سلوک سے ہیں اور حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب مدظلہم کے خلیفہ بھی ہیں۔ایسی بے بنیاد باتیں آپ کی شان کے لائق نہیں۔

نمبر۳:......آپ نے ہمارے بزرگ حضرت مولانا عبداللطیف صاحب جہلمی رحمۃ اللہ علیہ کو ان کی وفات کے بعد بھی معاف نہیں کیا اور یہاں تک لکھ دیا کہ وہ حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کو بدعتی سمجھتے تھے، تو ان سے خلافت نہ لیتے۔حالاں کہ مولانا عبدالرحیم صاحب چاریاری مدظلہ نے اپنی کتاب میں وضاحت فرما دی ہے کہ ہم حضرت لاہوریؒ کی مجالس ذکر کو بدعت نہیں کہتے۔ان کی مجالس میں اور آپ کی مروّجہ مجالس میں سات (۷) فرق ہیں۔تو پھر حضرت اقدس جہلمیؒ کے خلاف لکھنا ایک ولی اللہ، مجاہد عالم ربّانی کی بے ادبی ہے۔اللہ تعالیٰ اس سے آپ کو رجوع اور توبہ نصیب فرمائے۔(آمین)

نمبر۴:......آپ نے علماء کے خلاف جو زبان استعمال کی ہے، جس کا ذکر مولانا چاریاری صاحب مدظلہ نے اپنی کتاب ''مجالس ذکر اللہ کے نام پر علمائے دیوبند کے خلاف سازشیں'' کے ص ۲۵۸ر پر ذکر کیا ہے۔میری تو وہ الفاظ لکھنے کو طبیعت گوارا نہیں کرتی۔آپ جیسے.....خلیفہ مجاز اور استاذ حدیث کی یہ زبان نہیں ہونی چاہیے۔مولانا عبدالرحیم صاحب بھی اگر ہر جگہ یہ انداز اپناتے تو پڑھنے والے سب علماء سے متنفر ہوتے۔مجبوراً بعض جگہ انہوں نے قدرے تیزی کی ہے اور اس کی بھی ذمہ داری آپ پر ہے۔کیوں کہ جو ابتداء کرے ظلم کی، وہی ذمہ دار ہوتا ہے۔

نمبر۵:......حضرت مولانا مفتی انور صاحب مدظلہم العالی، حضرت مولانا عبدالقدوس صاحب ترمذی مدظلہم العالی اور حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالواحد صاحبؒ اور خود مولانا چاریاری صاحب...... کیخلاف جو کچھ لکھا ہے، اس کا ذکر مولانا عبدالرحیم چاریاری صاحب نے فرمایا۔میرے خیال میں آپ کو اپنا ضمیر بھی ملامت کرتا ہوگا کہ ایسے محقق علماء کے بارے مَیں نے کیسی غیر ذمہ دارانہ اخلاق سے گری ہوئی زبان استعمال کی ہے۔ہمارے اکابر تو رافضیوں، خارجیوں، مماتیوں وغیرہ کے علماء کا بھی نام احترام سے لیتے

ہیں۔ رَد، دلائل سے کرتے ہیں۔ خصوصاً حضرت مولانا مفتی جمیل الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم العالیہ جوکہ جامعہ اظہار الاسلام کے مہتمم بھی ہیں اور شیخ الحدیث بھی۔ اور حضرت اقدس وکیل صحابہ، پیر طریقت، رہبرِ شریعت مولانا قاضی مظہر حسین صاحبؒ کے قابل اعتماد ہیں۔ ۱۳؍سال حضرت قاضی صاحبؒ کی خدمت میں زندگی گزاری اور حضرتؒ نے ان پر اعتماد کرتے ہوئے ان کو اپنے چار خلفاء میں شامل فرمایا۔ حضرت قاضی صاحبؒ کے وصیت نامہ میں اس کا صراحتاً ذکر ہے۔ حافظ عبدالوحید صاحب حنفی مدظلہ نے بھی آپ کو اپنے مکتوب میں تحریر فرمایا ہے کہ آپ نے ان کی شان میں جو زبان درازی کی ہے، یہ ایک عالم دین کے قلم کو زیب نہیں دیتی۔ میں حیران ہوں کہ حضرت اقدس قاضی صاحب کے وصیت نامہ کی واضح عبارت جو سالہا سال سے شائع ہورہی ہے، آپ نے اس پر اعتماد نہیں کیا۔ اور مولانا سعید یوسف صاحب نے اگر ایسی بات فرمائی ہے تو تب، ان پر اعتماد کر کے حضرت مفتی صاحب کے خلیفہ ہونے کا انکار کر دیا۔ آخر حضرت مفتی صاحب مدظلہم العالی کے حضرت قاضی صاحبؒ کے خلیفہ ہونے سے آپ کے کن مفاد پر زد پڑتی ہے کہ آپ حضرت مفتی صاحب مدظلہٗ کو حضرت قاضی صاحبؒ کا خلیفہ تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں؟ حضرت مفتی صاحب مدظلہ میر طالب علمی زمانہ کے ساتھی ہیں، جب ہم جہلم جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام میں پڑھتے تھے۔ لیکن ان کے علم، تقویٰ اور خلوص اور حضرت اقدس سیدی مرشدی مولانا قاضی مظہر حسین صاحبؒ کے ان پر اعتماد کی وجہ سے میں ان کا احترام اپنے استاد اور مُرشد کی طرح کرتا ہوں۔ آپ کی خدمت میں بھی عرض ہے کہ حسد کو چھوڑ کر اپنے بزرگوں کے ہاں اپنا اعتماد پیدا کریں۔ بزرگوں کے اعتماد کے بغیر فتنوں سے بچنا مشکل ہے۔

نمبر ۶:...... میں حیران ہوں کہ علماء تو دین کا کام کرتے ہیں کہ اپنے اکابر کا مشن پھیلائیں، وہ خوش ہوں اور ان کی دعائیں نصیب ہوں۔ لیکن آپ عجیب آدمی ہیں کہ جس کتاب کی وجہ سے آپ کو اپنے شیخ کی ناراضگی کا ڈر تھا بلکہ وہ سخت ناراض بھی ہوئے ہیں۔ لیکن آپ کو اس کی کوئی پرواہ نہیں، پھر اس کتاب کو پھیلا رہے ہیں۔ ایسی کتاب جس سے اپنا شیخ ہی ناراض ہو جائے، اس کے لکھنے اور شائع کرنے کا کیا فائدہ ہے۔ بلکہ اپنے شیخ کی بھی بدنامی کا سبب بننے کا خطرہ ہے کہ جو پڑھے گا کہ اِس میں اتنے مغلظات ہیں اور لکھنے والے استاذِ حدیث بھی ہیں اور حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب ہزاروی مدظلہ.... کے خلیفہ مجاز بھی ہیں، تو وہ کیا سمجھے گا کہ حضرت ہزاروی مدظلہ نے ایسے اخلاق کے مالک کو جو بزرگوں اور علماء کا ادب نہیں کرتا، اس کو خلافت کیسے دے دی ہے۔

حضرت ہزاروی مدظلہ سے بڑا عرصہ ہمارا بھی تعلق رہا ہے، وہ تو بزرگوں کا ادب سکھلاتے تھے، ہم نے ان کی بڑی کثیر تعداد میں تقاریر سُنی ہیں۔ فرماتے تھے کہ: حضرت قاضی صاحبؒ کے رویں رویں سے ذکر کی خوشبو آتی ہے۔ اور جو ان سے ٹکراتا ہے، پاش پاش ہو جاتا ہے اور ان کا مسلک بالکل حق ہے۔ لیکن

افسوس ہے کہ اب وہ بھی ان بزرگوں پر چوٹیں کر جاتے ہیں جو ذکر اللہ کے نہیں بلکہ ایسی مجالس ذکر جو خلافِ سُنّت ہوں، ان کے خلاف ہیں۔

ان کا یہ بیان پڑھ کر بڑا افسوس ہوا کہ: ’’بعض لوگ اپنے آپ کو حضرت مدنیؒ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور مجالس ذکر کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور نعوذ باللہ اس کو بدعت قرار دیتے ہیں۔‘‘ [ماہنامہ زکریا:۲۲، مارچ ۲۰۱۷ء] حضرت مدنیؒ کی طرف نسبت کرنے والے جوان مجالس ذکر، جو سنت کے خلاف ہیں، کو بدعت کہنے والے تو حضرت قائد اہل سنت مولانا قاضی مظہر حسین صاحب اور امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور ترجمان علمائے دیوبند محقق اہل سنت حضرت مولانا مفتی عبدالشکور صاحب ترمذیؒ زیادہ مشہور ہیں۔

آپ لوگوں کا حال بھی اہل بدعت کی طرح یہ بن گیا ہے کہ ان کو نماز کے بعد مل کر جہراً کلمہ سے منع کرو تو کہتے ہیں: ’’یہ کلمہ کے منکر ہیں۔‘‘ جس طرح لا مذہب، غیر مقلدوں کو کہا جائے نماز میں آمین آہستہ کہیں تو وہ حنفیوں کو ’’آمین کا منکر‘‘ کہتے ہیں۔ اسی طرح مماتیوں کے من گھڑت ترجمہ اور تفسیر کو کوئی نہ مانے تو وہ کہتے ہیں کہ: ’’یہ قرآن کو نہیں مانتے۔‘‘ لیکن قرآن کا منکر کوئی نہیں اہل حق میں سے۔ بات ’’فہم قرآن‘‘ کی ہے کہ ہم اس میں سلف صالحین اکابر علمائے دیوبند کو حجت اور سند مانتے ہیں اور ان کی پیروی کرتے ہیں، اور مماتی حضرات اپنی من مانی تفسیر کو ترجیح دیتے ہیں۔

حضرت مولانا نذیر اللہ خانؒ بانی مدرسہ حیات النبی گجرات جو دیوبند کے فاضل تھے، حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے مرید تھے۔ اکثر ذکر فرماتے تھے۔ ایک مماتی عالم نے ایک آیت کا من گھڑت ترجمہ کیا تو مولانا نے یہ فرمایا کہ: مولانا تھانویؒ نے یہ دوسرا ترجمہ کیا ہے۔ تو وہ صاحب کہنے لگے: میں قرآن پیش کرتا ہوں اور آپ تھانوی صاحبؒ کو پیش کرتے ہیں۔ یہ جملہ کئی دفعہ دہرایا۔ تو میں (مولانا نذیر اللہ خان صاحبؒ) نے کہا کہ: مقابلہ قرآن کا نہیں بلکہ ترجمہ کا ہے کہ ترجمہ آپ کا بہتر ہے یا مولانا تھانویؒ کا؟ جو مفسر بھی، محقق بھی اور مجدد بھی تھے۔ اہل حق علماء سب ان کی تحقیقات پر اعتماد کرتے ہیں۔ اس پر وہ صاحب خاموش ہو گئے۔

اِسی طرح **کُلَّمَا دَخَلَ عَلَیْهَا زَکَرِیَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا** کا ترجمہ گجرات کے ایک شاہ صاحب نے کیا کہ: ’’جب ایک دفعہ زکریاؑ، حضرت مریمؑ کے پاس گئے تو وہاں رزق موجود تھا (یعنی کھانا)۔‘‘ تو مولانا نذیر اللہ خانؒ نے فرمایا: یہاں لفظ **کُلَّمَا** ہے، اس کا معنی: ’’جب کبھی‘‘ ہے، نہ کہ ’’ایک دن۔‘‘ اس پر بحث ہوتی رہی، تیسرے دن شاہ صاحب فرمانے لگے کہ: مولانا نذیر اللہ! بات تو آپ کی ٹھیک ہے، لیکن یہ ایک دن کی بات ہوتی تو مان لیتے۔ جب کبھی گئے تو کھانا موجود تھا، یہ کیسے؟ تو حضرت مولانا نذیر اللہ خانؒ نے فرمایا کہ: شاہ جی! جو خُدا مخلوق کو ہر روز روزی دیتا ہے، وہ حضرت مریمؑ کو کھانا یا پھل نہیں دے

سکتا؟ تب ان کی تسلی ہوئی۔

آپ حضرات اپنے جن مخالفین کو بھی ذکر کا مخالف سمجھ بیٹھے ہیں، یہ سب حضرات اکثر اکابرین کے مجاز ہیں اور کثرت سے خود بھی ذکر کرتے ہیں اور اپنے مریدین کو بھی اس کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے حضرت اقدس مولانا قاضی مظہر حسین صاحبؒ تو بیعت کرتے وقت فرماتے تھے کہ: ''ذکر روح کی غذا ہے، جس طرح کھانا جسم کی غذا ہے۔ اس کے لیے صبح وشام وقت نکالتے ہیں، اسی طرح ذکر کے لیے بھی وقت نکال کر توجہ و دھیان سے روزانہ پابندی سے ذکر کیا کریں۔'' حضرت شیخ الحدیث برکۃ العصر حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ جنہوں نے ''فضائل اعمال'' کتاب لکھی ہے۔ اور آپ اور آپ کے مرشد بھی تسلیم کریں گے کہ وہ کثرت سے ذکر اور درود شریف پڑھتے تھے اور دوسرے کو بھی تلقین فرماتے تھے۔ لیکن بدعتی طریقہ میں ذکر کرنے سے انہوں نے بھی منع فرمایا۔ تو کیا کوئی ان کو بھی ''ذکر کا منکر یا مخالف'' کہہ سکتا ہے؟ اس لیے انصاف کی بات کرنی چاہیے کہ یہ بزرگ ذکر کی مجالس کے خلاف نہیں، بلکہ خلاف سنت مجالس ذکر کے خلاف ہیں۔

نمبر ۷:......آپ کی کتاب کا اصل موضوع تو مروّجہ مجالس ذکر کا اثبات ہے۔ میں نے آپ کی کتاب کا مطالعہ غور سے کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ اپنے دعویٰ ''مروجہ مجالس ذکر'' کے ثبوت میں عاجز اور ناکام رہے ہیں، جس طرح بدعتی حضرات کو کہا جائے (کہ) اَذان کے اوّل وآخر میں صلوٰۃ وسلام ثابت کرو۔ تو وہ مطلقاً درود شریف کے فضائل بیان کرنے لگ جاتے ہیں۔ ان کو کہیں نمازِ جنازہ کے فوراً بعد ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا دفن سے پہلے پر دلیل پیش کرو تو ''**الدعا مخ العبادۃ**'' احادیث مطلق دعاء کے بارے میں سنانے لگ جاتے ہیں۔ آپ سے مطالبہ یہ کیا جاتا ہے کہ: ''مروجہ مجلس ذکر'' جن میں یہ سات صفتیں پائی جاتی ہیں، ان کا ثبوت پیش کریں، وہ سات (۷) صفات یہ ہیں:

۱: مجلس ذکر کا باقاعدہ اعلان وتشہیر کی جاتی ہے، جو تداعی (دعوت دینا) ہے۔

۲: ان ''مجالس'' ذکر کو عبادت مقصودہ اور مستحب سمجھا جاتا ہے۔

۳: یہ بہ آواز بلند کیا اور کروایا جاتا ہے اور اس میں جہر مفرط ہوتا ہے۔

۴: یا تو سب ہی ذاکرین آواز ملا کر ذکر کرتے ہیں۔

۵: یا پھر ایک شخص ذکر کروانے والا ہوتا ہے، باقی آواز ملا کر ذکر کرنے والے۔

۶: اپنی خانقاہ وغیرہ سے ہٹ کر عوامی اجتماعات میں بھی اسی طرح کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۷: مریدین اور غیر مریدین سب کو اسی طرح جہراً اجتماعی ذکر کرایا جاتا ہے۔

حالاں کہ اکابر اہل سنت دیوبند کے نزدیک اِن صفات کے ساتھ ذکر کرنا یا کرانا درست اور جائز نہیں بلکہ بدعت ہے۔ تفصیل کے لیے مولانا عبدالرحیم چاریاری مدظلہ کی کتاب ''مجالس ذکر کے نام پر

علمائے دیوبند کے خلاف سازشیں‘‘......کا مطالعہ کریں تو حقیقت اِن شاء اللہ واضح ہو جائے گی۔

آپ اپنی کتاب ’’مجالس ذکر اللہ کے خلاف سازشیں‘‘ میں ان شرائط کے ساتھ دلیل پیش کرنے سے عاجز اور ناکام رہے ہیں۔ اس لیے میری گزارش ہے اپنے اکابر حضرت گنگوہیؒ اور حضرت تھانویؒ، حضرت مدنیؒ، حضرت لاہوریؒ، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ وغیرہ اکابر جن کی ترجمانی حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحبؒ، امام اہل سنت مولانا محمد سرفراز خان صاحبؒ، حضرت مفتی عبدالستار صاحبؒ شہید ختم نبوت مولانا محمد یوسف صاحبؒ لدھیانوی، حضرت مولانا مفتی عبدالشکور صاحب ترمذیؒ اور موجودہ سارے بزرگ حضرت شیخ الحدیث مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سومرو مدظلہم العالی، حضرت امام المناظرین امین ملت مولانا محمد امین صفدرؒ کے علمی جانشین حضرت مولانا مفتی محمد انور صاحب مدظلہم اور حضرت مولانا مفتی عبدالقدوس صاحب ترمذی مدظلہم اور حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب چاریاری مدظلہم اور مولانا حمزہ احسانی مدظلہ اس مسلک اور موقف کی ترجمانی اور تبلیغ فرما رہے ہیں۔

ماہنامہ ’’صفدر‘‘ جس کا نام آپ نے بگاڑ کر ’’الضرار‘‘ رکھا ہے، وہ بھی اور حضرت مولانا مفتی جمیل الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم العالیہ یہ سارے اکابرین علمائے اہل سنت علمائے دیوبند کے ہی ترجمان ہیں۔ اپنا کوئی نیا مسلک انہوں نے نہیں بنایا ہے، جیسا کہ آپ کا گمان ہے۔ (معاذ اللہ)

نمبر۸:......آپ نے خود لکھا ہے کہ آپ کے مرشد حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب ہزاروی مدظلہم العالی حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحبؒ کے خلاف تو کوئی بات برداشت نہیں کرتے۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے خود حضرت قاضی صاحبؒ کی ایک تحریر جہلمیؒ نمبر کی، اس کو تبرّا قرار دیا ہے۔ آپ نے اپنے شیخ کی بھی ناراضگی کا خیال نہیں فرمایا۔ آپ کے مرشد تو حضرت قاضی صاحبؒ کا روحانی مقام بھی جانتے ہیں، اس لیے اُن کی مخالفت برداشت نہیں کرتے۔ لیکن آپ نے یہاں تک نقل کر دیا ہے کہ (مولانا ہزاروی کے خلیفہ) مولانا مفتی اسماعیل ونجارہ صاحب نے کہا کہ: مفتی عبدالواحد صاحبؒ تو بس ایم بی بی ایس ڈاکٹر، وہ کوئی باقاعدہ مفتی تو نہیں۔ جس طرح آپ نے مفتی جمیل الرحمٰن صاحب مدظلہ کے مفتی ہونے کا انکار کیا ہے۔ شاید اب مفتی بننے کے لیے آپ حضرات کی تصدیقی مہر کی ضرورت ہے۔ اور حضرت سیدی مرشدی حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحبؒ کے بارے میں مفتی اسماعیل نے کہا کہ: وہ چوں کہ ہر کسی پر تنقید کرتے تھے اِس لیے ان کو دینی خدمات کی توفیق نہیں ملی۔ اور یہ کہا کہ: ’’میں ان کے مدرسہ میں گیا تھا، وہاں کچھ بھی نہیں تھا، کُتّے بھونک رہے تھے۔‘‘ معاذ اللہ۔

اس کو مجنون کی بڑ بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ صاحب تو حضرت قاضی صاحبؒ کی دشمنی میں بہت ہی جلے بھنے ہوئے ہیں۔ شاید ایسی بکواس تو قادیانی رافضی خارجی بھی نہ کرتا۔ جہاں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے

سات آٹھ سو بچے بچیاں قرآن پڑھ رہے اور دینی تعلیمات حاصل کر رہے ہیں، ان کو وہاں کچھ بھی نظر نہ آیا۔ ان صاحب کو حدیث: **"من عادی لی ولاو اذنته بالحرب"** کا مضمون ذہن میں رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوبوں کے بُغض سے محفوظ رکھے۔ (آمین)

لیکن میں حیران ہوں آپ نے ایسی خرافات اپنی کتاب میں نقل کیسے کر دی ہیں کہ یہ حدیث بھول گئے کہ کسی آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ ہر سنی سُنائی بات کو آگے پھیلا دے۔[1]

نمبر۹:......اسی طرح آپ کے پیر بھائی مولانا نثار احمد الحسینی صاحب، مماتیوں کے خلاف اُن کی تحریریں پڑھ کر (مجھے) اُن سے غائبانہ محبت تھی۔ لیکن حضرت قاضی صاحبؒ کے بارے میں ان کی یہ تحریر پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی ہے کہ انہوں نے حضرت قائد اہل سنت وکیل صحابہ و اہل بیت کو، صحابہؓ پر تنقید و تنقیص کے نشتر چلانے والا تک لکھ دیا ہے، اور تعجب ہے ان کو ترجمانِ اہل سنت بھی لکھتے ہیں۔ کیا اُن کے نزدیک صحابہ کرامؓ پر تنقید و تنقیص کے نشتر چلانے والا بھی اہل سنت کا ترجمان ہو سکتا ہے؟ اس طرح تو وہ مودودی صاحب کو بھی ترجمان اہل سنت مان لیں گے۔ اگر انصاف سے کام لیتے تو مجالس ذکر مروّجہ خلاف سنت کو مکروہ (و) بدعت کہنے کی وجہ سے حضرت قاضی صاحبؒ کی خدمات کا انکار نہ کرتے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ اور اہل بیت عظام سے محبت کا وہ بلند مقام عطا فرمایا تھا کہ ان کے دشمنوں سے مذہبی اتحاد تو کجا، ان سے وقتی طور پر سیاسی اتحاد بھی گوارا نہ تھا اور علماءِ حق نے ان کو وکیلِ صحابہؓ کا لقب دیا۔ مولانا عبدالکریم ندیم صاحب مدظلہ نے حضرت خواجہ خان محمد صاحبؒ کی نماز جنازہ سے قبل بیان میں فرمایا تھا کہ: حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے شاگردوں نے ختم نبوت کا محاذ خوب سنبھالا اور اس پر خوب کام کیا۔ اور شیخ العرب والعجم حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے شاگردوں نے صحابہؓ اور اہل بیتؓ کے دفاع میں خوب کام کام ہے۔ جیسے حضرت قاضی مظہر حسین صاحبؒ، امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور حضرت علامہ عبدالستار صاحب تونسویؒ۔ ان حضرات کی خدمات کا انکار تو دوپہر کے سورج کے انکار کے مترادف ہے۔

نمبر۱۰:......آپ نے مولانا عبدالرحیم صاحب چاریاری مدظلہ کی نسبت ''چاریاری'' کے بجائے ''پنج تنی'' اور ''اثناعشری'' اور ''غیر مقلد'' ہونے اور ''رافضی'' ہونے ذکر کیا۔ مولانا! اپنے دل سے پوچھیں کہ:

---

[1] اپنے آپ کو ''فقیہ العصر'' کہلوانے کے شوقین کہروڑ پکا ضلع لودھراں کے مفتی اسماعیل ونجارہ صاحب کی یہ گفتگو مولانا حفیظ اللہ صاحب نے نقل نہیں کی، نہ ہی مولانا عبدالرحیم چاریاری مدظلہم نے اِس نقل کی نسبت مولانا حفیظ اللہ کی طرف فرمائی ہے۔ صاحبِ مکتوب مدظلہم سے یہاں تسامح ہو گیا ہے۔ البتہ مولانا چاریاری مدظلہم نے مولانا عزیز الرحمٰن ہزاروی صاحب اور اُن کے خلفاء کی نازیبا گفتگوؤں میں مولانا اسماعیل ونجارہ صاحب کی اِس گفتگو کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اور اِس گفتگو کے گواہ بحمداللہ حیات ہیں۔ [ادارہ]

یہ الزامات قیامت کے دن آپ ثابت کر سکیں گے۔ یہاں تو اپنے بُغض کو ٹھنڈا کرنے اور اپنی بھڑاس نکالنے کے لیے یہ سب کچھ آپ نے لکھ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں بھی جواب دینا ہے، مخالفت کی اس انتہاء کو نہ پہنچ جائیں۔ سلفیوں سے مال لینے کا طعن بھی آپ نے ان پر کیا ہے، لیکن آپ نے تو اپنی کتاب میں آخر میں غیر مقلدین کے بارے بڑا نرم رویہ رکھا ہے۔ جو تیزی اکابر علمائے دیوبند کے خلاف کی ہے، غیر مقلدین کے بارے میں نرم الفاظ ہیں اور احترام باقی رکھا ہے۔ شاید آپ کو مال مل گیا ہے، یا اُمید لگا بیٹھے ہیں۔

آپ نے خدام اہل سنت کے جلسوں اور نعروں کا بھی مذاق اُڑایا ہے اور اعتراض کیا ہے۔ حالانکہ یہی نعرے ہم نے آپ کے مرشد مولانا عزیز الرحمٰن صاحب مدظلہ کی مسجد میں بھی سُنے ہیں۔ جب کہ حضرت قاضی صاحبؒ اور حضرت علامہ تونسویؒ کے وہاں بیانات ہوئے، میں خادم بھی شریک تھا۔ جہلم چکوال کے علاقوں میں انہی نعروں اور انہی جذبات کے ہوتے ہوئے آپ کے مرشد تقریریں کرتے رہے، انہوں نے کبھی اس پر انکار نہیں کیا۔ ختم نبوت زندہ باد، سارے علماء نعرہ لگاتے ہیں۔ نعرۂ تکبیر کے علاوہ بھی باقی نعرے اپنے عقیدے کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس لیے سارے اکابر مسجدوں میں نعرے بلند کرنے سے نہیں روکتے تھے۔

تفصیل کے لیے مولانا عبدالرحیم صاحب چاریاری مدظلہ کی کتاب کا مطالعہ تعصب کی عینک اتار کر بار بار کریں۔ سنت اور بدعت کی حقیقت سمجھنے کے لیے حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ کی کتاب ''براہین قاطعہ'' جس کی تائید حضرت گنگوہیؒ نے بھی فرمائی ہے۔ اور حضرت مولانا محمد سرفراز خان صاحب صفدرؒ کی کتاب ''راہِ سنت'' کا ضرور مطالعہ فرمائیں۔

آخر میں یہ عرض ہے کہ آپ کی مجالس ذکر اگر جائز ہوں، مستحب بھی ہوں، لیکن یہ فقہاء کا قاعدہ ہے کہ مستحب اور بدعت میں شک پڑ جائے تو مستحب کو چھوڑ دینا ضروری ہے تا کہ بدعت میں مبتلاء نہ ہوجائیں۔ بلکہ بدعت سے بچنے کے لیے تو فقہاء نے سنت کو چھوڑنا بھی اختیار فرمایا ہے۔ اس لیے آپ حضرات ان مروّجہ مجالس ذکر جن کو اکابر محقق علمائے اہل سنت مکروہ اور بدعت فرماتے ہیں، ان سے اجتناب کریں۔ (ذکر سے کوئی مسلمان نہیں روکتا، غیر شرعی مجالس سے روکا جاتا ہے۔) انفرادی طور پر ذکر اللہ کی تبلیغ فرمائیں تا کہ اہل حق علماء میں پھوٹ نہ پڑے۔ اور جس طرح سب حضرات باقی فرقہ باطلہ کے خلاف کام کر رہے تھے، آپ بھی اسی نہج پر آپس میں متحد ہو کر باطل کے خلاف کام کریں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اکابر علمائے اہل سنت علمائے دیوبند سے تا زندگی جوڑے رکھے اور اخلاص سے دین کی خدمت کے لیے قبول فرمائے رکھے۔ **آمین بجاہ النبی الکریم ﷺ. وما توفیقی الا باللہ. و ما ارید الا الاصلاح**...... خط کے جواب کا منتظر ہوں۔ اوّل فرصت میں جواب سے مستفید فرمائیں۔ ایک ماہ تک انتظار کے بعد اس کو ماہنامہ ''صفدر'' میں شائع کر دیا جائے گا۔ فقط: والسلام، ۱۹/محرم ۱۴۴۱ھ ☆

شیخ الحدیث مولانا فضل الرحمٰن دھرم کوٹی مد ظلہم دوسری اور آخری قسط

اللہ کے گھر کی طرف

......سفر نامہ عمرہ......

مسجد حرام:

کعبہ مکرمہ کے اردگرد مسجد حرام ہے۔ جس میں "مَطَاف" بھی شامل ہے، مطاف کے پیچھے چوکور برآمدوں کی صورت میں مسجد بنائی گئی ہے۔ کئی برآمدے یکے بعد دیگرے بنائے گئے ہیں، سب سے اول ترکی کا برآمدہ ہے، جس کی چھت گنبدیوں کی صورت میں بنائی گئی تھی، سعودیہ والوں کو ترکی کی یہ یادگار رڑ گئی تھی، اس لیے اسے منہدم کر کے اسی طرز کی نئی عمارت بنائی گئی ہے جو بہت خوبصورت اور بہت مضبوط ہے۔ برآمدوں میں قالین بچھے رہتے ہیں، زیادہ رش کی صورت میں صفیں اندر تک آجاتی ہیں۔ نبی پاک ﷺ کے زمانے میں مسجد بہت چھوٹی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں بھی کچھ توسیع نہ کی گئی۔ پہلی دفعہ حضرت عمرؓ کے دور میں توسیع ہوئی، اردگرد کے مکانات خرید کر مسجد میں شامل کر لیے گئے۔ پھر حضرت عثمانؓ کی خلافت میں بھی مزید توسیع ہوئی، انہوں نے بھی مزید مکانات خرید کر اس میں شامل کیے، جو لوگ اپنے مکانات بیچنا نہیں چاہتے تھے ان سے بھی زبردستی لے کر مناسب قیمت ان کو دی گئی کیونکہ یہ ایک قومی کام تھا جس پر انفرادی کام کو قربان کر دیا گیا۔

ازاں بعد حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے بھی مشرقی جانب بہت توسیع فرمائی۔ ان کے بعد ابوجعفر منصور عباسی نے اس میں اور توسیع کی جو مشرقی، شامی اور مغربی جانب تھی۔ اس کے بیٹے مہدی نے بھی توسیع کا بہت کام کیا، جو یمنی اور مغربی جانب تھا۔ سلطان سلیم ترکی نے ساری عمارت شہید کر کے اسے از سر نو تعمیر کرایا، اور لکڑی کی چھت کی بجائے گنبددار چھت بنوائی تاکہ وہ کسی آگ کے حادثے میں متاثر نہ ہو سکے، یہ تعمیر ۹۸۴ھ میں مکمل ہوئی، لیکن سلطان اس کی تعمیر سے پہلے ہی فوت ہو گیا۔ جزاہ اللہ خیراً۔

سعودی دور میں سب سے بڑی توسیع کا آغاز ہوا، شاہ عبدالعزیز آل سعود نے مسجد میں سنگ مرمر کا فرش لگوایا، رنگ و روغن کروایا، دروازوں اور برآمدوں کے فرش درست کرائے، سعی والی جگہ پر بھی فرش لگوایا، اوپر سائبان بھی بنوایا، اگرچہ اس سے پہلے شریف حسین نے بھی مَسْعٰی کا سائبان کسی حد تک بنوایا تھا، یہ کام ۱۳۳۹ھ میں ہوا۔ سعودی دور میں مسجد حرام کی کی پہلی توسیع شاہ سعود بن عبدالعزیز نے کرائی، مسعیٰ کے دونوں جانب بنے ہوئے مکانات گرا کر مسعیٰ کو کشادہ کر دیا اور اس کو دو منزلہ کر دیا، ہر منزل میں دورویہ راستے بنائے

گئے، درمیان میں جنگلہ لگا دیا گیا تا کہ آنے جانے والوں کا ٹکراؤ نہ ہو، پہلی منزل میں سولہ دروازے بنائے گئے جن میں سے گزر کر مسجد حرام میں داخلہ ہوتا تھا، دوسری منزل میں جانے کے لیے دو راستے رکھے گئے ،ایک صفاء پر دوسرا مروہ پر، پھر جنوبی سائیڈ کی عمارت بھی گرا کر دو منزلہ خوبصورت برآمدہ بنا دیا گیا۔

پوری مسجد کے اکاون (۵۱) دروازے ہیں، جن میں سے چار بڑے ہیں۔ باب السلام، باب العمرہ، باب الفہد اور بابِ عبدالعزیز، باقی چھوٹے ہیں اور مسجد کے کل مینار سات ہیں۔ سعودی دور کی توسیع میں ایک لاکھ ترپن ہزار (۱،۵۳،۰۰۰) مربع میٹر کا اضافہ کیا گیا، جس سے مسجد کا رقبہ چھ گنا بڑھ گیا، جبکہ اس سے پہلے رقبہ ستائیس ہزار آٹھ سو پچاس (۲۷،۸۵۰) مربع میٹر تھا۔ مزید براں توسیع والی ساری عمارات ایسی بے مثال ہیں جو شاہی محلات کو شرما دیتی ہیں۔ میں نے کابل کا شاہی محل دیکھا ہے، وہ بھی اس سے بہت کمتر ہے، ایسے لگتا ہے کہ فرشتوں نے یہ بنایا، جنت سے لا کر یہاں رکھ دیا ہے۔ مسجد نبوی کے علاوہ دنیا کی کوئی عمارت اس کی ہمسری نہیں کر سکتی۔

بیت اللہ شریف:

مطاف کے بیچوں بیچ حسین محبوب کی طرح سیاہ لباس میں ملبوس محبوں اور زائروں کے لیے بیت اللہ بن ٹھن کے کھڑا ہے ؎

زلفیں سیاہ تیری شرماتی ہیں شبوں کو　　　مکھڑے سفید سے ہے چاند کو رقابت

(افضلؔ)

جو شخص اس سے مصافحہ کرنا چاہے تو حجرِ اسود کو چھو لے، اس سے اللہ تبارک کے ہاتھوں سے مصافحہ ہو جاتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے پاؤں چھونا چاہتا ہو وہ سجدے میں گر جائے، وہ ایسے ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے پاؤں میں سر رکھ دیا ہو۔

بیت اللہ کو سب سے پہلے فرشتوں نے بنایا، پھر حضرت آدمؑ نے بنایا، پھر حضرت ابراہیمؑ نے بتعاون حضرت اسماعیلؑ بنایا، جس میں حجرِ اسود حضورؐ نے نصب فرمایا تھا۔ قریش نے بنایا تو تھا بنائے ابراہیمی پر مگر خرچے کی کمی کی وجہ سے حطیم کا حصہ باہر چھوڑ دیا تھا، یہ تقریباً چھ ہاتھ تھا، اس میں بھی اللہ کی حکمت و مصلحت کارفرما تھی کہ جو لوگ غربت کی وجہ نذر دے کر اندر نہیں جا سکتے تھے وہ یہیں نماز پڑھ لیں تو کعبہ کے اندرون کی نماز کا ثواب مل جائے گا۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے کعبہ کے اندر نماز پڑھنے کا شوق ظاہر کیا تو حضورؐ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر حطیم میں کھڑا کر دیا کہ یہاں بھی وہی ثواب ہے، قریش نے دروازہ چھ ہاتھ اونچا کر کے لگایا تھا تا کہ کوئی شخص بلا نذر دیئے اندر نہ جا سکے، کیونکہ نذر وصول کر کے ہی سیڑھی لگائی جاتی تھی۔

ازاں بعد حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے حضور علیہ السلام کی خواہش کے مطابق ابراہیمی بنیادوں پر بنایا اور اس کے دو دَروازے بنائے، ایک مشرق میں اور ایک مغرب میں، تاکہ ایک دروازے سے لوگ آئیں اور دوسرے سے چلے جائیں، اور اس کی کرسی زمین کے برابر رکھی جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رکھی تھی۔ حضرت ابن زبیرؓ کے سامنے حضور ﷺ کی یہ حدیث تھی، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ: رسول اللہ نے مجھے فرمایا: عائشہ! تجھے علم ہے کہ جب میری قوم نے کعبہ بنایا تھا تو وہ بیت اللہ کو مکمل ابراہیمیؑ بنیادوں پر نہیں بنا سکے تھے بلکہ کچھ حصہ کم کر دیا، میں نے کہا کہ: اے اللہ کے رسول! آپ اسے شہید کر کے مکمل ابراہیمی بنادوں پر کیوں تعمیر نہیں کرادیتے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **لولا حدثان قومک بالکفر لفعلت.** یعنی اَبھی تیری قوم کے لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں، اگر ان کی مخالفت کا خطرہ نہ ہوتا تو میں ایسے کر گزرتا۔ اسی وجہ سے حضرت ابن زبیرؓ نے حضور ﷺ کی خواہش کے مطابق حجر وحطیم کی جگہ اندر لے کر کعبہ تعمیر کیا، دروازے بھی دو بنائے، کرسی بھی نیچی رکھی، پھر جب عبدالملک بن مروان کے حکم سے حجاج بن یوسف زبیری نے عمارت کو ڈھا کر پھر قریش کی صورت میں بنایا، کیونکہ وہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی بنائی ہوئی عمارت اور اس کی ہیئت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ پھر اسی صورت میں آج تک باقی ہے۔

بیت اللہ کا طول وعرض:

خانہ کعبہ کی موجودہ عمارت سلیٹی رنگ کے بڑے بڑے پتھروں سے بنائی گئی ہے جو جبل ہندی سے لیے گئے ہیں۔ اس کی کرسی چھ فٹ اونچی ہے، اس کا عرض تقریبا ۳۳/فٹ اور طول تقریبا ۵۵/فٹ ہے اور اونچائی ۴۵/فٹ ہے، خانہ کعبہ کی عمارت کو عقیدت سے دیکھنا بھی عبادت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پانچ چیزوں کی طرف دیکھنا بھی عبادت ہے:

۱: کلام اللہ کی طرف دیکھنا ۲: بیت اللہ کی طرف دیکھنا ۳: والدین کی طرف محبت سے دیکھنا ۴: چاہِ زمزم کے پانی کو دیکھنا ۵ رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ اقدس کی طرف دیکھنا۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے جو حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ: جو شخص تھوڑی دیر بیت اللہ کی طرف منہ کر کے بیٹھا رہے وہ اللہ تعالیٰ کے اجر وثواب کا امیدوار رَہے۔ اس کے دل میں بیت اللہ کی عظمت و محبت ہو تو اس شخص کے لیے حج وعمرہ اور جہاد کا ثواب ہے۔ جو شخص بیت اللہ کے دیدار میں مشغول ہوتا ہے اسکی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: اللہ تبارک وتعالیٰ بیت اللہ پر ۱۲۰/رحمتیں نازل فرماتا ہے: ۶۰/طواف کرنے والوں کے لیے، ۴۰/نماز پڑھنے والوں کے لیے اور ۲۰/محض بیت اللہ کا نظارہ کرنے والوں کے لیے۔ حضرت سعید بن مسیّبؒ سے مروی ہے: جو شخص اللہ اور اسکے رسول ﷺ پر ایمان رکھتا

ہو اور ان کی باتوں کو سچ جانتا ہو اسکا کعبہ کی طرف دیکھنا اسکو گناہوں سے ایسا پاک وصاف کر دیتا ہے گویا اسے اسکی ماں نے آج ہی جنا ہو۔(زیارات حرمین)

مکہ ٹاور:

حرم مکہ کے جنوبی پہلو میں جہاں پہلے قدیم ترکی قلعہ ہوتا تھا اسکو مسمار کر کے مکہ ٹاور کی عجوبہ روزگار بلند و بالا عمارت بنائی گئی ہے۔اسکی ۱۲۰/منزلیں ہیں، جو منزل زمین کے برابر ہے اسکے سینٹر میں ایک بہت بڑا ہال ہے، جس میں بس سٹینڈ ہے، دفاتر ہیں، فائر بریگیڈ ہے، شرطوں کی قیام گاہیں ہیں، بسوں کی دورویہ گزر گاہ ہے، اس سے اوپر والی منزل میں صرافہ بازار ہے، سونا چاندی جگ مگ، جگ مگ کر رہا ہے، ہماقسم کے زیوارات عورتوں کے لیے ایک بڑی آزمائش بنے ہوئے ہیں۔اس سے اوپر والی منزل میں بیسیوں ہوٹل ہیں۔اس سے اوپر رہائش گاہیں ہیں جو گراں کرائے پر چلتی ہیں، مکانات ہیں، تفریح گاہیں ہیں، آٹھ فائیو سٹار ہوٹل ہیں جن میں ایک کمرے کا کرایہ ایک ہزار سے لے کر تین ہزار ریال تک یومیہ ہے اور حج کے دنوں میں تین لاکھ تک کرایہ بڑھ جاتا ہے۔یہ محیر العقول عمارت بن لادن کمپنی نے تعمیر کی ہے۔بن لادن کمپنی کی ۲۶/شاخیں ہیں، ہر شاخ میں تقریباً ایک لاکھ ملازم کام کرتے ہیں۔

یہ ٹاور دنیا کا تیسرا بڑا ٹاور ہے۔اول نمبر پہ ''**البرج الخلیفہ**'' دبئی میں ہے۔جس کی بلندی ۸۲۵/میٹر ہے، دوسرے نمبر پر ''شنگھائی ٹاور'' چین میں ہے جس کی بلندی ۶۲۵ میٹر ہے۔تیسرے نمبر پہ مکہ ٹاور ہے جسے ''**ابراج البیت**'' کہتے ہیں، اسکی بلندی ۶۰۱/میٹر ہے، اس کی تعمیر ۲۰۰۴ء میں شروع ہوئی اور ۲۰۱۲ء میں مکمل ہوئی۔اس پر ۱۵/ملین ڈالر لاگت آئی ہے۔اس عمارت میں ۹۶/لفٹیں کام کرتی ہیں۔اس ٹاور کی چوطرفہ گھڑیاں آٹھ میل سے نظر آتی ہیں۔اس کی ہر گھڑی میں ایک لاکھ بلب روشن ہوتے ہیں، اس کی چوٹی پہ جو چاند ہے اس میں چھ کمرے ہیں جو دفاتر کا کام دیتے ہیں۔انہی میں سے ایک کمرے میں مسجد ہے، یہ مسجد دنیا کی بلند ترین مسجد ہے۔

ٹاور کے نویں فلور میں ایک واقعی مسجد ہے جس میں بیک وقت دس ہزار نمازی حرم کی جماعت کے ساتھ نماز پڑھ سکتے ہیں۔اس عمارت میں لگے کلاک میں سے ہر ایک ۴۳/میٹر لمبا ہے، اس کی بڑی سوئی ۲۱/میٹر کی ہے اور چھوٹی ۱۷/میٹر کی۔بیس سال تک اس کا منافع بن لادن کمپنی کو ملے گا۔ازاں بعد اس کی آمدنی حرم کے لیے وقف ہے۔اس کے چاند سے ایک لائٹ نکلتی ہے جو خاص خاص مواقع پر نمائش کی جاتی ہے۔عید، شبِ برات اور رمضان المبارک میں وہ لائٹ آسمان کی طرف دس کلومیٹر تک اوپر تک چلی جاتی ہے، وہ اتنی تیز ہوتی ہے کہ جو چیز بھی اس کے سامنے آجائے وہ جل کر راکھ ہو جاتی ہے، سارے مکہ مکرمہ میں

دیکھی جاسکتی ہے، صرف اس لائٹ کا خرچہ ایک لاکھ ریال ہے۔ اس ٹاور کا محیط اکتیس لاکھ چھ ہزار تین سو اُٹھائیس (۳۱،۰۶،۳۲۸) میٹر ہے۔

یہ معلومات ہمارے مخلص دوست شکیل احمد تبسم نے مہیا کی ہیں، جو اسی ٹاور میں ملازم ہے اور گھر کا بھیدی ہے، بڑے قوی حافظے کا مالک ہے، میں خیال کرتا تھا کہ اگر یہ علم دین پڑھتا تو علامۂ زماں اور محدثِ دوراں ہوتا، مگر مقدر میں اس کا کوئی دوسرا ہی کام تھا، تاہم پرہیز گار اور صوم وصلوۃ کا پابند ہے، ملتان کے علاقے کا رہائشی ہے، اس کا والد جمیل احمد ہمارے جلیل احمد برادران خانقاہ شریف کو کریانہ کا سامان ملتان سے لاکر سپلائی کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہے، اس نے ہماری کئی دفعہ دعوت بھی کی، ایک دفعہ مکہ ٹاور میں ہوئی اور ایک دو دفعہ ہمارے کمرے میں لے آیا، بہت ملنسار، بڑا متواضع، دوستوں کا بہترین دوست اور بزرگوں کا خدمت گزار ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے جزائے خیر سے نوازے اور عاقبت بخیر کرے۔ (آمین)

ایک نئی زیارت:

ہمارے دوست شکیل احمد تبسم بعد از عشاء ہمیں سیر کے لیے لے گئے، منیٰ، مزدلفہ اور عرفات، مسجد نمرہ، مسجد مشعر الحرام، مسجد خیف اور اس کے اطراف میں بنے ہوئے جمرہ اولیٰ، جمرہ وسطیٰ اور جمرہ عقبہ دکھائے۔ اور ایک ہوٹل پہ کھانا بھی کھلایا۔ پھر ایک نو دریافت قدیمی مسجد میں لے گئے جو بنو عباس کے ابتدائی دور یا انتہائی دور کی ہے۔ موجودہ کھدائی میں وہ دریافت ہوئی ہے، مسجد کا ہال اور اس کی دیواریں سالم ہیں، چھت ندارد ہے، اس کے بے در کے تین دروازے ہیں، اس کے مغربی دونوں کونے گول کیے ہوئے ہیں، دیواروں پہ مٹی کا پلستر صحیح سالم ہے، رات کے اندھیرے میں موبائل کی روشنی سے اس کے کتبے کو پڑھنے کی کوشش کی، ہم اتنا سمجھ سکے کہ خلیفہ ابو جعفر منصور المستنصر باللہ کے عہد میں تعمیر کی گئی۔ خلیفہ ابو جعفر منصور عباسیوں کا دوسرا خلیفہ ہے، اس لحاظ سے یہ دوسری صدی کی یادگار ہے، ایسے لگتا ہے کہ یہ دونوں ناموں کو ملا دیا گیا ہے، یہ ایک معمہ ہے، شائد کوئی صاحب علم/صاحب تاریخ اس کو حل کر سکے۔

ایک مظلوم مرگھٹ:

یہ **وأد البنات** کا مصداق ہے۔ جہاں اہل مکہ اپنی معصوم بچیوں کو زندہ درگور کیا کرتے تھے کہ ان کو کما کر کھلانا نہ پڑے اور تاکہ کوئی اس کا داماد نہ کہلا سکے۔ یہ کتنی بڑی حماقت ہے، اگر تیری ماں سے بھی ایسا سلوک کیا جاتا تو تُو کہاں سے ہوتا؟ نسل انسانی کیسے چلتی؟ بخاری شریف میں ایک قصہ بہ تفصیل مذکور ہے کہ ایک بے درد باپ اپنی معصوم بچی کو بہلا پھسلا کر ساتھ لے گیا، کسّی کے ساتھ گڑھا کھودا اور وہ معصوم پوچھتی رہی کہ کیا کر رہے ہو؟ کچھ جواب نہ دیا، پھر اٹھا کر اسے گڑھے میں پھینک دیا، جلدی جلدی مٹی ڈالی اور سر پہ

گسّی مار کے اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔

یہ ایک بیگہ کے برابر جگہ ہے، چار دیواری کی ہوئی ہے، لیکن بڑی وحشت ناک اور ڈراؤنی جگہ ہے، غیر ہموار، بے آباد۔ کہتے ہیں یہاں وقتاً فوقتاً تعمیر کرنے کی کوشش کی جاتی رہی، مگر وہ زمین میں دھنس جاتی تھی۔ یہ بابِ فہد کے مغربی جانب بالکل قریب ہی ہے۔ ہم نے پہلی دفعہ دیکھی ہے۔

طائف کی طرف:

قرآن پاک میں ''**رجلاً من القریتین عظیم**.'' کا ایک مصداق طائف ہے، اِس لیے طائف دیکھنے کا شوق تھا، مگر پہلے سفروں میں وہاں نہ جا سکا تھا، اس کی یاد دِل میں چٹکیاں لے رہی تھی، اپنے بعض مقیم دوستوں سے اس کا اظہار کیا کہ: وہ ہمیں طائف دکھا دیں! لیکن قانونی پابندیوں کی وجہ سے کسی نے حامی نہ بھری، حسن اتفاق سے ایک شام کسی بس کمپنی کا نمائندہ ہمارے ہوٹل میں آ گیا، اس نے پیشکش کی کہ اگر کوئی طائف جانا چاہتا ہو تو وہ بکنگ کروائے صبح سات آٹھ بجے ہماری بس طائف کو جائے گی۔ اندھا کیا چاہے، بس دو آنکھیں! ہم نے تیس ریال فی کس کرایہ ادا کر دیا اور ساری رات طائف کے خواب دیکھتے رہے۔ میں فضل الرحمٰن، مولوی عتیق الرحمٰن (مرحوم ومغفور) اور قاری عمر فاروق تینوں تیار ہو کر اس نمائندے کے ساتھ صبح سات بجے روانہ ہو گئے۔ ان کی بس کبری کے پاس کھڑی تھی، وہاں جا کے سوار ہو گئے، خلیل احمد کو اس کا ذوق نہیں تھا، اس لیے وہ خواتین کے ساتھ رہا۔

کوئی آٹھ بجے کے قریب ہماری بس روانہ ہوئی اور راستے میں کئی ہوٹلوں سے اس نے سواریاں اٹھائیں، جو راستہ عرفات کو جاتا ہے، یہی آگے طائف کو نکل جاتا ہے، طائف مکہ مکرمہ سے ۴۵/میل گویا ۷۰/کلومیٹر ہے۔ لیکن جس وقت ہمارے آقا جہاں نبی رحمت ﷺ طائف کے سرداروں کو دعوت اسلام دینے گئے تھے، اُس وقت یہ سو کلومیٹر سے بھی زیادہ تھا، اَب نئی سڑکوں نے اسے قریب کر دیا ہے۔ کئی پہاڑ کاٹ کر ان میں سیدھی سڑک نکالی گئی تو یوں فاصلہ کم ہو گیا۔ راستے میں ایک بڑا مقام قرن المنازل آیا جسے السیل الکبیر بھی کہتے ہیں، دونوں نام وہاں لکھے ہوئے ہیں، یہ طائف سے آنے والوں اور نجد سے آنے والوں کا میقات ہے، ہم نے واپسی میں یہیں سے عمرے کا احرام باندھا تھا۔

مکہ مکرمہ کی زمین تو اَب بھی بنجر ہے۔ لیکن طائف کے سفر میں جیسے جیسے بلندیوں کی طرف چڑھتے گئے پہاڑوں اور وادیوں میں سبزہ نمودار ہوتا گیا، سبزیاں، چھوٹی موٹی فصلیں کیاریوں کے اندر محدود پیمانے پر نظر آنے لگیں، جگہ جگہ باغات بھی دیکھنے میں آئے۔ ''کرا'' کا علاقہ بلند پہاڑیوں کا ہے، پھر طائف تک بلندی برقرار رہتی ہے، طائف کا موسم خوشگوار ہے، کئی میل دُور سے طائف کے اِکا دُکا مکانات شروع ہو

گئے۔ موجودہ طائف وہ نہیں جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھا، وہ تو میل ہا میل کے آخری سرے میں چھوٹی بستی تھی، یہ نیا طائف بڑھتا بڑھتا بہت دُور تک آ گیا ہے۔ ہماری بس کوئی گیارہ بجے کے قریب منزل مقصود پر پہنچی۔ بس سٹینڈ کے بالکل سامنے مسجد ابن عباس پوری شان وشوکت سے کھڑی نظر آئی، ہمیں ایک گھنٹے کا وقفہ دیا گیا کہ اس میں جو کچھ دیکھنا ہے دیکھ لیں! ہم وضو کر کے مسجد کی طرف چل پڑے، مسجد کے ایک حجرے میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا مزارِ پرانوار ہے مگر دروازے پر قفل چڑھا ہوا ہے، عام طور پر وہ زیارت نہیں کرنے دیتے کہ یہ لوگ کوئی شرکیہ افعال نہ کریں، جیسے ہمارے ہاں کے غیر مقلدوں کو توحید کا ہیضہ ہو چکا ہے، ان کے ہاں بھی ایسا ہی ہے، بلکہ یہ لوگ گستاخیاں وہاں سے سیکھ کر آتے ہیں اور یہاں آ کر چلاتے ہیں۔ لہٰذا دروازہ بند ہونے کے باعث ہم نے بس دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھ لی اور دعاء خیر دی اور مسجد میں داخل ہو گئے، مسجد ہمارے تخیل سے بھی طول وعریض ہے، بڑے ہال کے مغربی حصے میں طالب علموں کی ایک جماعت بیٹھی مطالعے میں مصروف تھی، ہم نے ان کے مطالعے میں خلل ڈالنا مناسب نہیں سمجھا، اندازاً بیس ستون لمبائی میں اور بیس ہی چوڑائی میں صفیں باندھے کھڑے ہیں اور ہر دو ستونوں کے درمیان تین صف کا فاصلہ ہے یعنی بارہ فٹ کا، تو گویا ۲۴۰ رفٹ لمبی اور ۲۴۰ رفٹ چوڑی ہے، ۲۴۰ رکو ۲۴۰ رسے ضرب دیں تو مربع رقبہ (ستاون ہزار چھ سو [۶۰۰، ۵۷] فٹ) نکل آئے گا۔ طائف میں اس کے علاوہ بھی کئی مسجدیں ہیں: مسجد علی، یا مسجد عداس، مسجد حبشی۔ مسجد علی کے بارے میں کہتے ہیں کہ حضور ﷺ زخمی ہونے کے بعد اس مقام پر ٹھہرے تھے۔ یہیں عداس نے آپ کو انگور کا خوشہ پیش کیا تھا، یہیں سے حضرت زید رضی اللہ عنہ آپ کو کندھوں پر اٹھا کر نیچے لے آئے

غلام با وفا زید ابن حارث ڈھونڈتا آیا
متاع دہن کو طائف سے کندھوں پر اٹھالا یا

مسجد علی تو برلب سڑک باغ کے دروازے پر ہے، دوسری مسجد حبشی باغ کے اندر دُور سے نظر آ رہی تھی۔ ایک چھوٹی سی مسجد ''مسجدِ کوع''، جس کے قریب ایک پتھر لڑھک کر زمین سے دو فٹ اونچا لٹکا ہوا ہے، کہتے ہیں: یہاں حضور ﷺ آرام کرنے کے لیے بیٹھے تھے، کافروں نے اوپر سے پتھر لڑھکا دیا جو حضور ﷺ کے قریب آیا تو حضور ﷺ نے فرمایا: رُک جا! تو وہ وہیں رک گیا جس کی ہیئت بڑی تعجب خیز ہے، عقلی توجیہ ممکن نہیں۔

حضرت ابن عباس طائف میں کیوں؟

جب حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سربرآرائے خلافت ہوئے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ

عنہما کا ان سے کسی مسئلے پر اختلاف ہوگیا جو شدت اختیار کرگیا۔ کسی بدمزگی سے بچنے کے لیے حضرت ابن عباسؓ مکہ چھوڑ کر طائف میں آ کر مقیم ہوگئے اور یہیں ان کی وفات ہوئی۔ ابن عباسؓ **حِبرُ الأُمّة** کا لقب رکھتے ہیں، یعنی امتِ محمدیہ کا بڑا عالم۔ یہ عظیم مفسر قرآن ہیں، تفسیر ابن عباسؓ (جس کی نسبت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف کی جاتی ہے۔) مطبوعہ ملتی ہے۔ حضور ﷺ نے ان کے لیے فقاہت کی دعا کی تھی، تاویل القرآن بھی انہیں سکھائی تھی۔ خلفائے بنی عباس جنہوں نے پانچ سال عالم اسلام پر حکومت کی تھی سب انہی کی اولاد میں سے ہیں، ہارون رشید اور مامون رشید جیسے باجبروت بادشاہ ان کی ذریت میں ہیں۔ نوابانِ بہاول پور بھی اپنے آپ کو انہی کی طرف منسوب کر کے ''عباسی'' کہلاتے ہیں۔

طائف سے واپسی:

بارہ بجے کے قریب جب بس کی سب سواریاں بس میں سوار ہوگئیں تو بس واپسی کے لیے چل پڑی۔ کوئی ایک بجے کے قریب ہم ''قرن المنازل'' پر پہنچے جہاں احرام باندھنا تھا، وہاں بھی بس والوں نے ایک گھنٹہ کی چھٹی دے دی، ہر ایک نے غسل کر کے احرام باندھا، اسی مقصد کے لیے یہاں کثیر تعداد میں غسل خانے بنے ہوئے ہیں اور بہت صاف ستھرے ہیں۔ ساتھ ہی اچھی بڑی مسجد ہے، جس میں ہم نے احرام کے نفل پڑھے اور لبیک پڑھنا شروع کر دیا، میری احرام والی چپل ہوٹل میں رہ گئی تھی، اس لیے یہاں سے چپل خریدنا پڑی۔ سب لوگ فارغ ہوگئے تو بس چلنا شروع ہوگئی، عصر کے بعد مکہ مکرمہ پہنچے، بس نے حرم سے فاصلے پر اُتار دیا، وہاں سے پیدل حرم شریف پہنچے۔ وضو کر کے نماز پڑھی۔ مغرب کی نماز حرم میں باجماعت نصیب ہوئی۔ الحمدللہ۔ مغرب کے بعد عمرہ کے لیے طواف کی توفیق ہوگئی، عشاء کے بعد سعی بین الصفا بھی کر کے عمرہ پورا کرلیا۔ (**فالحمدللہ تعالیٰ علیٰ ذالک تقبل اللہ منا و غفرلنا**)

عمرے:

ہم نے ایک عمرہ تو شروع میں مکہ مکرمہ آتے وقت کیا، پھر دوسرا اور تیسرا عمرہ مسجد عائشہ سے احرام باندھ کر کیے، چوتھا عمرہ طائف سے واپسی، پانچواں عمرہ جعرانہ سے احرام باندھ کر کیا۔ جعرانہ سے احرام بھی ہمارے دوست شکیل احمد صاحب نے اپنی گاڑی سے جا کر بندھوالیا۔ میں نے ایک عمرہ اپنی طرف سے، ایک عمرہ حضرت والد صاحب کی طرف سے، ایک عمرہ والدہ صاحبہ کی طرف سے، ایک عمرہ مرحوم بڑے بھائی مولوی عبدالرحیم کی طرف سے اور ایک اپنی مرحومہ بیوی کی طرف سے جس کا قرض میرے ذمے تھا۔ وہ اس طرح کہ وہ عمرے کے لیے پیسے جمع کر رہی تھی اور ہم دونوں نے ہی جانا تھا مگر اس کا عمرہ اللہ کو منظور نہیں تھا وہ فوت ہوگئی، آدھے پیسے مجھے وراثت میں مل گئے۔ اس لیے میں سمجھتا تھا کہ اخلاقاً اس کی طرف سے عمرہ کرنا

چاہئے، چنانچہ میں نے اس موقع پر وہ قرض ادا کر دیا، اللہ تعالیٰ اس کی بھی اور میری بھی مغفرت فرمائے۔ آمین

وطن واپسی:

۲/نومبر کو ہماری واپسی تھی، کمپنی والوں نے ہمیں متنبہ کر دیا کہ رات کو بارہ بجے چلنے کے لیے تیار رہیں۔ہم نے آخری طواف بھی ظہر کے بعد کرلیا،عصر،مغرب اور عشاء کی نمازیں بھی حرم شریف کے اندر باجماعت پڑھ لیں۔سامان مکمل طور پر لپیٹ کر پابہ رکاب بیٹھ گئے۔ ہماری بس ایک بجے کے قریب پہنچی،ہم اس میں سوار ہو کر حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے جدہ کی طرف چل نکلے،دو اڑھائی بجے ہم جدہ پہنچ گئے۔فلائٹ کا مقرر ٹائم صبح چار بجے تھا،مگر پھر اعلان ہوا کہ فلائٹ صبح چار بجے کی بجائے شام چار بجے جائے گی۔ہم وہاں بنچوں پر لیٹے رہے، فجر کی نماز وہیں پڑھی، پھر سعودی ائیر لائن نے مہربانی کر کے یہ وقت گزارنے اور ناشتہ کرانے کے لیے ہمیں بسوں میں سوار کر کے جدہ شہر کے ایک فائیو سٹار ہوٹل پر پہنچا دیا، ہماری بس بہت آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دو گھنٹے میں ہوٹل تک پہنچی، وہاں سواریوں کو اتار کر کچھ دیر بعد کمرے الاٹ کر دیئے۔ہم کمروں میں جا کر بستروں پر دراز ہو گئے۔گھنٹہ دو گھنٹہ بعد انہوں نے ہمیں ناشتہ دیا جو کسی حد تک اچھا ہی تھا۔ ہوٹل کے تکلفات اس کے ناشتے سے بہتر تھے۔ہم نہا دھو کر اگلے سفر کے لیے تیار ہو گئے۔کوئی ساڑھے بارہ کے قریب ہیں وہاں سے اٹھا لیا اور ایئر پورٹ پہنچا دیا۔وہاں سامان کی با آسانی بکنگ ہو گئی۔اندر جانے کے لیے قطار در قطار کھڑے ہو گئے۔آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے کاؤنٹر تک پہنچے، انہوں نے قانونی کاروائی مکمل کر کے ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔میں سب سے پہلے اندر گیا، وہاں سامنے ہی ایک بینچ پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا، پندرہ بیس منٹ کے بعد سارے ساتھ اندر آ گئے اور ہم ایک جگہ اکٹھے ہو گئے۔جب جہاز کی روانگی کا اشارہ دیا گیا تو ہم مل کر اس سرنگ میں داخل ہو گئے جو طیارے کے اندر پہنچا دیتی ہے۔اچانک ہم نے دیکھا کہ ہم تو طیارہ کے اندر داخل ہو گئے ہیں، وہاں ہمیں الگ الگ سیٹوں پر بٹھا دیا۔چار بجے طیارہ چل پڑا اور ہم رات نو بجے کے قریب ملتان ائیر پورٹ پہ جا اُترے، وہاں ایمیگریشن کے مسائل بھگتتے بھگتتے بارہ بج گئے۔خانقاہ شریف سے ہمارے عزیز مطیع الرحمٰن ،اور خلیل برادران دو گاڑیاں لائے ہوئے تھے،ان پہ سوار ہو کے ہم بفضل خدا خیر و عافیت کے ساتھ گھر پہنچ گئے۔

اللھم لا تجعل هذا السفر آخر سفرنا وامنن لنا الرجوع إلى الحرمين مرة بعد مرة وصلى الله تعالىٰ علىٰ خير خلقه محمد وآله واصحابه اجمعين برحمتك ياارحم الراحمين.

☆......☆......☆......☆

مولانا مفتی محمد طارق محمود

محدثین اور فقہاء کے اصول حدیث

ایک تقابلی جائزہ...... چند بنیادی نکات میں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محترم جناب مدیر ماہنامہ ''صفدر'' دام اقبالہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت محترم! ایک مضمون ماہنامہ ''صفدر'' میں اشاعت کی غرض سے ارسال خدمت ہے۔ اس کا واقعہ یہ ہوا کہ بندہ کو محدثین اور فقہاء کے اُصول حدیث کے تقابلی مطالعے کا شوق تھا۔ چنانچہ تدریس اور افتاء وغیرہ کی مصروفیت کے ساتھ تقریباً پانچ سال تک یہ مطالعہ جاری رہا۔ بندہ اس دوران اہم نکات ضبط کرتا رہا۔ اختتام مطالعہ پر بندہ نے حاصل مطالعہ دس نکات کی شکل میں شیخ الاسلام حضرت مفتی محمد تقی عثانی دام ظلہ کی خدمت میں ارسال کیا، تاکہ حضرت اس کی اصلاح فرمادیں۔ الحمدللہ حضرت نے ان نکات کی تصویب فرمائی۔ وہ خط ساتھ منسلک ہے۔ حضرت تقی دام ظلہ کا جواب دوسرے احباب کی خدمت میں بھی پیش کیا۔ سب نے پسند فرمایا۔ بعض احباب نے مشورہ دیا کہ ان نکات کی مزید وضاحت پر مشتمل ایک مضمون تحریر کریں تو بہتر ہے۔ چنانچہ بندہ نے ''محدثین اور فقہاء کے اصول حدیث: ایک تقابلی جائزہ چند بنیادی نکات میں'' وضاحتی مضمون لکھا۔ خط اور وضاحتی مضمون دونوں آپ کی خدمت میں ارسال ہیں۔ امید ہے کہ آنجناب اسے اپنے مؤقر ماہنامے میں شائع فرمائیں گے۔ جزاکم اللہ تعالیٰ خیرا محمد طارق محمود عفی عنہ

متخصص فی الحدیث و الفقہ و الافتاء...... مدرس و معین مفتی جامعہ عبداللہ بن عمر، لاہور

۲۲/رجب ۱۴۴۱ھ/ ۱۷/مارچ ۲۰۲۰م

عریضہ بنام مفتی محمد تقی عثانی مدظلہم اور حضرت کا جواب:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بخدمت حضرت شیخ الاسلام مولانا مفتی محمد تقی عثانی صاحب دام ظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ اللہ تعالیٰ حضرت والا کا سایہ صحت وعافیت کے ساتھ تادیر قائم رکھیں آمین

حضرت محترم! بندہ کو فقہائے مجتہدین اور محدثین کے اصول حدیث کے تقابلی مطالعہ کا شوق تھا۔

تدریس وافتاء وغیرہ کی مصروفیت کے ساتھ اللہ تعالی کی توفیق سے تقریباً پانچ سال میں یہ مطالعہ پورا ہوا۔اس کے بنیادی نتائج چند نکات کی صورت میں پیش خدمت ہیں۔حضرت والا سے درخواست ہے کہ ان میں جو غلطی ہو اس کی اصلاح فرمادیں تاکہ اطمینان کے ساتھ طلبہ کو یہ باتیں بتا سکوں۔

۱......حدیث شریف سے بحث واعتناء کرنے والی اہل علم کی دو جماعتیں ہیں:

ایک جماعت فقہائے مجتہدین اور اصولیین کی ہے، چنانچہ اصول فقہ کی ہر کتاب میں باب السنۃ کے عنوان کے تحت اصول حدیث مذکور ہیں۔فقہاء کے اصول حدیث معلوم ہونے کی اصل جگہ یہی ہے۔

دوسری جماعت محدثین کی ہے۔حدیث شریف کی کتابی تدوین کا عروج تیسری صدی ہجری میں صحاح ستہ کی تالیف ہے، لہٰذا صحاح ستہ کے بعد محدثین نے اصول حدیث کے موضوع پر جو کتب لکھیں ان میں مؤلفین صحاح ستہ کی فنی آراء کو مرکزی حیثیت حاصل رہی، ضمناً اور تبعاً کہیں کہیں فقہاء کے اصول ملتے ہیں۔

۲......ان دونوں جماعتوں کا موضوع بحث ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہے۔محدثین کا اصل کام حدیث کی سماعت وروایت وحفاظت ہے، تاکہ غیر حدیث حدیث نہ بنے۔فقہائے مجتہدین کا کام حدیث شریف کو بطور مصدر تشریع لینا ہے۔اس سے احکام اور قوانین کا استنباط کرنا ہے۔لہٰذا یہ قانونی اور تشریعی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔حدیث کے ثبوت سے آگے بڑھ کر اس کی عملی حیثیت اور احکام کی تفصیلی درجہ بندی ان کا مطلوب ہے۔ان کا دائرہ بحث محدثین سے اعم واشمل ہے۔

۳......ان دونوں جماعتوں کی اصطلاحات اور قواعد میں باہم کئی جگہ اختلاف بھی ہے۔اس کا بنیادی مقصد ان کے ہدف اور مقصد کا اختلاف ہے۔

۴......حضرات محدثین نے اپنے مقصد کو سامنے رکھ کر اپنے اجتہاد سے حدیث کے ثبوت اور عدم ثبوت کا ایک معیار اور پیمانہ مقرر کیا ہے۔اسی طرح فقہاء نے اپنے مقصد کے پیش نظر اپنے اجتہاد سے حدیث کے ثبوت اور عدم ثبوت کا ایک معیار اور پیمانہ مقرر کیا ہے، جو محدثین کے معیار سے قدرے مختلف ہے۔بسا اوقات حدیث محدثین کے اصول پر ثابت نہیں ہوتی، مگر فقہاء کے اصول پر ثابت ہوتی ہے۔ وبالعکس ایضا۔

۵......محدثین کی زیادہ تر بحث خبر واحد کی سند سے ہوتی ہے۔سند میں دو امر قابل لحاظ ہیں۔ ا: ثقاہت رواۃ (یعنی سب عادل وضابط ہوں)۔۲: اتصال سند۔شذوذ وعلت درحقیقت سند کے ان دو اوصاف کی کمی ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ثقاہت اور اتصال کی تفصیل فقہاء کے ہاں محدثین سے مختلف ہے۔

۶......حدیث پر عمل کرنے کے لحاظ سے محدثین کا عمومی طریقہ یہ ہے کہ صحیح مرفوع حدیث کے ظاہری معنی لیتے ہیں۔اور جہاں احادیث میں بظاہر تعارض ہو وہاں تطبیق دیتے ہیں یا قوت سند کی بنا پر ترجیح دیتے ہیں۔دوسری طرف فقہاء کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن مجید، مرفوع احادیث، شریعت کے عام قوانین، صحابہ اور تابعین کے فتاوی اور عمل، حکم کی علت، شارع کی غرض، ثبوت اور دلالت کے لحاظ سے دلائل کے مراتب وغیرہ جملہ امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے حدیث کی عملی حیثیت متعین کرتے ہیں۔اور کئی طرح کے قرائن وشواہد کی بنا پر حدیث کے ظاہری معنی مراد نہیں لیتے۔

۷......مقصد اور طرز عمل کا یہ اختلاف، اختلاف رائے سے آگے بڑھ کر طعن وتشنیع کی حد تک بھی پہنچا ہے۔فقہاء نے کسی قرینے کی بنا پر حدیث کے ظاہری معنی چھوڑ کر معنائے محتمل مراد لیے تو محدثین نے اس پر مخالفت حدیث اور رائے کا طعن کر دیا، خصوصا حنفیہ اس ملامت کا زیادہ ہدف بنے ہیں۔اس کا بنیادی سبب یہ ہوا کہ حنفیہ کے اصول وفروع کو براہ راست ان سے سمجھا نہیں گیا۔دُور ہی دُور سے ازخود سرسری طور پر دیکھا گیا اور سمجھ نہ آنے پر معاندانہ رویہ اختیار کر لیا گیا۔نتیجۃً حنفیہ کے دلائل اور رِجال کے ساتھ انصاف کم ہی ہوا۔ورنہ جنھوں نے براہ راست ان سے سمجھا انھوں نے صاف اعلان کر دیا کہ فقہ میں سب لوگ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے محتاج ہیں۔اور ظاہر ہے کہ فقہ کی بنیاد تو حدیث ہی ہے۔

۸......طالب علم اور باحث پر لازم ہے کہ ان دونوں جماعتوں کی اصطلاحات اور قواعد مستحضر رکھے اور دونوں کو اپنے اپنے درجے پر رکھے تاکہ علم وبحث کا حق ادا ہو۔

۹......عمل بالحدیث سب ائمہ کی مشترک میراث ہے۔البتہ عمل کیانداز اور طریقے میں کچھ فرق ہے۔کوئی ظاہری معنی تک رہتا ہے، تو کوئی اس سے آگے بڑھ کر غرض اور مراد کا کھوج لگاتا ہے۔اجتہادی اختلافات کو اپنی حدود میں رکھنا ضروری ہے، ورنہ مسلمانوں کی وحدت پارہ پارہ ہو جائے گی۔

۱۰......سب ائمہ کیساتھ ادب اور حسن ظن لازم ہے۔

حضرت والا سے گزارش ہے کہ اس کی اصلاح فرمادیں اور اپنی رائے گرامی تحریر فرمادیں۔

فجزاکم اللہ تعالی خیرا۔ والسلام علیکم

خویدمکم: محمد طارق محمود عفی عنہ......۶رصفر ۱۴۴۱ھ/ ۶را کتوبر ۲۰۱۹م

باسمہ سبحانہ مکرمی! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمدللہ جو نکات آپ نے لکھے ہیں، بحیثیت مجموعی درست ہیں۔

والسلام......محمد تقی......۱۷/۲/۴۱ھ

(مسلک خط کی تشریح میں لکھا جانیوالا مضمون)

۱......حدیث شریف سے بحث واعتناء کرنے والی اہل علم کی دو جماعتیں ہیں:

ایک جماعت فقہائے مجتہدین اور اصولیین کی ہے، چنانچہ اصول فقہ کی ہر کتاب میں باب السنۃ کے عنوان کے تحت اصول حدیث مذکور ہیں۔ فقہاء کے اصول حدیث معلوم ہونے کی اصل جگہ یہی ہے۔

دوسری جماعت محدثین کی ہے۔ حدیث شریف کی کتابی تدوین کے عروج کا دور تیسری صدی ہجری میں صحاح ستہ کی تالیف ہے، لہٰذا اصحاح ستہ کے بعد محدثین نے اصول حدیث کے موضوع پر جو کتب لکھیں، ان میں مولفین صحاح ستہ کی فنی آراء کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ ضمناً اور تبعاً کہیں کہیں فقہاء کے اصول ملتے ہیں۔

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ کا ارشاد ہے: محدثین نے جو اصول حدیث کی صحت وضعف کے لیے مقرر کیے ہیں، وہ آسمانی وحی سے مقرر نہیں کیے، بلکہ اپنے ظن واجتہاد سے مقرر کیے ہیں، ایسے ہی ہمارے فقہاء نے بھی صحت وضعف حدیث کے لیے کچھ اصول مقرر کیے ہیں جو اصول فقہ کی بحث السنۃ میں مذکور ہیں۔ [مقالات عثمانی: ۲/۹۱، مرتب: مولانا شفیع اللہ، بیت العلوم، لاہور، سن ندارد]

شارح نور الانوار ملاجیون بحث السنۃ کے شروع میں فرماتے ہیں:

وهذا (أی البيان فی هذا الباب) على طبق أصول الفقه لا أصول الحديث وإن اشتركا فی بعض الأسامي والقواعد. [نور الأنوار: ۱۷۶، سعيد، كراتشي دون التاريخ]

قوله على طبق أصول الفقه لاأصول الحديث .أقول: أی على طبق علم أصول الفقه لاعلم أصول الحديث حسب الاصطلاح، وإلا فلا شك أن المذكور هناك فی الحقيقة أصول الحديث كما هو أصول الفقه أيضا .طارق

عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ اصول حدیث سارے کے سارے، مقدمہ ابن صلاح، شرح نخبہ، تدریب الراوی وغیرہ چند ایک مشہور کتب میں ہیں بس۔ ان کے علاوہ اُصول حدیث کا کوئی وجود نہیں، اور ان کتب مذکورہ میں لکھے ہوئے قواعد سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ سو یہ بات محض ناواقفیت پر مبنی ہے۔ کتب اُصول فقہ کا باب السنۃ بھی اُصول حدیث ہی کے موضوع پر ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وہاں محدثین کی اصطلاحات وآراء ہیں اور یہاں فقہاء واُصولیین کی۔

۲......ان دونوں جماعتوں کا موضوع بحث ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہے۔ محدثین کا اصل کام حدیث کی سماعت و روایت وحفاظت ہے، تاکہ غیر حدیث حدیث نہ بنے۔ فقہائے مجتہدین کا کام حدیث شریف کو بطور مصدر تشریع لینا ہے۔ اس سے احکام اور قوانین کا استنباط کرنا ہے۔ لہٰذا یہ قانونی اور

تشریعی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ حدیث کے ثبوت سے آگے بڑھ کر اس کی عملی حیثیت اور احکام کی تفصیلی درجہ بندی ان کا مطلوب ہے۔ ان کا دائرۂ بحث محدثین سے اعم واشمل ہے۔

قال النواب صديق حسن القنوجی: إلا أن معرفة التواتر والآحاد والناسخ والمنسوخ و إن تعلق تبع لما لحديث لكن المحدث لايفتقر إليه لأن ذلك من وظيفة الفقيه لأنه يستنبط الأحكام من الأحاديث فيحتاج إلى معرفة التواتر والآحاد والناسخ والمنسوخ فأماالمحدث فوظيفته أن ينقل ويروى ما سمعه من الأحاديث كما سمعه فإن تصدى لما رواه فزيادة فی الفضل انتهى كلام ابن الأثير.[الحطة فی ذكر الصحاح الستة: ص ۱۰۰،ت: علی حسن الحلبی،دارالجيل،بيروت دون التاريخ]

قال الحازمی: نعم يفيد هذا (أی قوة السند) فی باب الترجيحات عند تعارض الأخبار حالة المذاكرة بين المتناظرين، وذلك من وظيفة الفقهاء لأن قصدهم إثبات الأحكام ومجال نظرهم فی ذلك متسع.

[شروط الأئمة الخمسة: ص ۳۳، ت: الشيخ الكوثری، المكتبة الأزهرية، مصر ط:۲۰۰۵م]

ڈاکٹر محمد میاں صدیقی صاحب فرماتے ہیں: اس موقع پر ایک اور بات قابل غور ہے، اور وہ یہ کہ محدثین اور فقہاء کی نوعیت کار میں فرق ہے۔ اسکو سمجھنا ضروری ہے۔ یہ دونوں گروہ بادی النظر میں ایک دوسرے کے مقابل اور مخالف نظر آتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں۔ بات یہ ہے کہ ان دونوں کے طریق کار میں بہت باریک، مگر بنیادی فرق ہے۔ ایک طبقے کی توجہ اور کاوش کا مرکزی نقطہ فقہ کی ترتیب وتدوین کا کام تھا اور دوسرے کی نظر تدوین حدیث کے کام پر تھی۔ [مجموعہ مقالات تدريب المعلمين: ۲۰۷،۲۰۸/ ملخصا بلفظه، مرتب: مفتی محمد اکرم کمبوہ، دار العلوم الاسلامیہ، لاہور ط:۱۴۳۱ھ]

۳......ان دونوں جماعتوں کی اصطلاحات اور قواعد میں باہم کئی جگہ اختلاف بھی ہے۔ اس کا بنیادی سبب ان کے ہدف اور مقصد کا اختلاف ہے۔

۴......حضرات محدثین نے اپنے مقصد کو سامنے رکھ کر، اپنے اجتہاد سے حدیث کے ثبوت اور عدم ثبوت کا ایک معیار اور پیمانہ مقرر کیا ہے۔ اسی طرح فقہاء نے اپنے مقصد کے پیش نظر، اپنے اجتہاد سے حدیث کے ثبوت وعدم ثبوت کا ایک معیار اور پیمانہ مقرر کیا ہے، جو محدثین کے معیار سے قدرے مختلف ہے۔ بسا اوقات حدیث محدثین کے اصول پر ثابت نہیں ہوتی، مگر فقہاء کے اصول پر ثابت ہوتی ہے۔ وبالعكس ايضا.

قال الحازمی: ثم ينبغی أن يعلم أن جهات الضعف متباينة متعددة وأهل العلم مختلفون فی أسبابه. أما الفقهاء فمدارك الضعف عندهم محصورة وجلها منوط بمراعاة

ظاهر الشرع، وعند أئمة النقل أسباب أخر مرعية عندهم، وهى عند الفقهاء غير معتبرة. ثم أئمة النقل أيضا على اختلاف مذاهبهم وتباين أحوالهم فى تعاطى اصطلاحاتهم يختلفون فى أكثرها. فرب راو هو موثوق به عند عبد الرحمن بن مهدى ومجروح عند يحيى بن سعيد القطان وبالعكس .وهما إمامان عليهما مدار النقد ومن عندهما يتلقى معظم شأن الحديث.
[شروط الأئمة الخمسة:٥٩،٦٠]

قال الأمير الصنعانى: قال ابن دقيق العيد: إن لكل من أئمة الفقه والحديث طريقا غيرطريق الآخر فإن الذى تقضيه قواعد الأصول والفقه أن العمدة فيتصحيح الحديث عدالة الراوى وجزمه بالرواية ونظر هم يميل إلى اعتبار التجويز الذى يمكن معه صدق الراوى وعدم غلطه فمتى حصل ذلك وجاز أن لايكون غلطا وأمكن الجمع بين روايته ورواية من خالفه بوجه من الوجوه الجائزة لم يترك حديثه فأما أهل الحديث فإنه مقديروون الحديث من رواية الثقات العدول ثم تقوم لهم علل تمنعه معن الحكم بصحته. انتهى كلامه بنصه. وهوصريح فى اختلاف الاصطلاحين فى مسمى الصحيح من الحديث كما قررنا هو الحمد لله.
[توضيح الأفكار لمعانى تنقيح الأنظار:١/٢٣،٢٤، ت: أبو عبد الرحمن صلاح، دارالكتبالعلمية, بيروت– لبنان الطبعة: الأولى ١٤١٧ھ]

قال الشيخ محمد عوامة: قال الجصاص (الرازى الحنفى الفقيه المحدث) وهو يتكلم عن حديث لا نكاح إلا بشهود وهذه الأخبار كلها عند أهل الحديث ضعيفة، بعضها من جهة الرجال وبعضها من جهة الإرسال .والصحيح عندهم ما يروى عن أنس مرسلا...... وهى عندنا صحيحة من أكثر الوجوه التى رويت فيه، وليس طريقة الفقهاء فى قبول الأخبار طريقة أصحاب الحديث، ولا نعلم أحدا من الفقهاء رجع إليهم فى قبول الأخبار وردها ولا اعتبر أصولهم...... قال الشيخ عوامة: فهذه أقوال جمهرة من من أئمة الحديث والأصول والفقه فى اعتماد طريقة الفقهاء فى القبول والرد دون إنكار عليهم وإنكار المنكرين عليه فيه بعد عن الصواب وإلزام لهم بما لا يلزمهم. [تدريب الراوى مع حاشية ابن العجمى وتعليقات عوامة:٢/١٤٤،١٤٥، دار اليسر، دار المنهاج ط: ١٤٣٧ھ]

قال الذهبى: فَكَمْ مِن حديثٍ تردَّدَ فيه الحُفَّاظُ: هل هو حسَن؟ أو ضعيف؟ أو صحيحٌ؟ بل الحافظُ الواحدُ يتغيَّرُ اجتهادُه فى الحديث الواحد: فيوماً يَصِفُه بالصحة، ويوماً يَصِفُه بالحُسن، وَلَرُبَّما استَضْعَفَه! (الموقظة فى علم المصطلح :٢٨،٢٩، ت: عبدالفتاح أبوغُدّة، مكتبةالمطبوعات الإسلامية بحلب ط:١٤١٢ھ]

قال ماهر ياسبن الفحل: توثيق الرجال وتضعيفهم أمر اجتهادى.
[الفوائد والقواعد الحديثية:١١،vb.tafsir.net]

قال ابن مهدى: معرفة الحديث إلهام. قال ابن نمير: وصدق لو قلت له من أين قلت لم يكن له جواب. [قواعد فى علوم الحديث :٤٥٧، الحاشية: ١، ت: عبد الفتاح أبو غدة،

إدارة القرآن، کراتشی ط:دون التاریخ]

اس سے معلوم ہوا کہ رواۃ و مرویات کو محدثین کا صحیح وضعیف کہنا ان کی رائے سے ہوتا ہے، جس کی بنیاد ان کا ظن واجتہاد ہوتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے فقہاء احکام شرعیہ کے بارے میں اجتہاد کرتے ہیں۔ ان دونوں کی حقیقت ایک ہی ہے۔ محدثین کے فیصلوں کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ خبر محض ہے، اس میں رائے کو دخل نہیں، بالکل غلط ہے۔ محدثین کی تصحیحات و تضعیفات ماننے کو اتباع کہہ کر فرض قرار دینا اور فقہاء کی اجتہادات کی پیروی کو تقلید کہہ کر حرام کہنا محض لفظی ہیر پھیر ہے۔ دونوں کی ماہیت ایک ہی ہے۔ اگر لینا ہے تو دونوں کو لینا پڑے گا اور اگر چھوڑنا ہے تو دونوں کو چھوڑنا ہوگا۔ ایک کو حرام اور دوسرے کو فرض کہنا محض عصبیت اور سینہ زوری ہے۔ اعاذنا اللہ منہ

اُصولیین اور محدثین میں اصطلاحات میں اختلاف کی ایک مثال حدیث کی تعریف میں اختلاف ہے۔

قال الجزائری: الحدیث أقوال النبی صلی الله علیه وسلم وأفعاله ویدخل فی أفعاله تقریره وهو عدم إنکاره لأمر رآه أوبلغه عمن یکون منقاد اللشرع وأما ما یتعلق به علیه الصلاة والسلام من الأحوال فإن کانت اختیاریة فهی داخلة فی الأفعال وإن کان تغیر اختیاریة کالحلیة لم تدخل فیه إذ لا یتعلق بها حکم یتعلق بنا وهذا التعریف هو المشهور عند علماء أصول الفقه وهو الموافق لفن هم.

وذهب بعض العلماء إلی إدخال کل مایضاف إلی النبی علیه الصلاة والسلام فی الحدیث فقال فی تعریفه علم الحدیث أقوال النبی علیه الصلاة والسلام وأفعاله وأحواله وهذا التعریف هو المشهو رعند علماء الحدیث وهو الموافق لفنهم فیدخل فی ذلك أکثر مایذکر فی کتب السیرة کوقت میلاده علیه الصلاة والسلام ومکانه ونحو ذلك.[توجیه النظر إلی أصول الأثر:۱، ت: عبدالفتاح أبوغدة، مکتبةالمطبوعات الإسلامیة – حلب ط:۱۴۱۶ھ]

اصطلاحات میں اختلاف کی دوسری مثال ''مرسل'' کی تعریف میں اختلاف ہے۔

المراد (بالمرسل) أن یحذف الراوی من السند، سواء کان المحذوف الصحابی السامع منه صلی الله علیه وسلم أو من بعده، وسواء کان المحذوف واحدا أو أکثر أو جمیع الرواة. فهذه الأقسام کلها من المرسل. هذا علی اصطلاح أهل الأصول. وأما أهل الحدیث فقالوا إنه لو حذف السامع منه صلی الله علیه وسلم وقال التابعی السامع منه قال رسول الله صلی الله علیه وسلم فهو مرسل. ولو حذف الراوی فیما بین السند فهو المنقطع کأن یقول تبع التابعی قال أبو هریرة رضی الله عنه ولو حذف أول السند أو تمام السند فهو المعلق کأن نقول قال رسول الله صلی الله علیه وسلم کذا .هکذا قال الشیخ الدهلوی فی مقدمة مصطلحات علم الحدیث. [نور الأنوار:۱۸۴، الحاشیة :۱۹]

قواعد میں اختلاف کی ایک مثال ’’مرسل‘‘ کے حکم میں اختلاف ہے۔

قال الشيخ محمد عوامة: ذهب جمهور المحدثين إلى أن المرسل ضعيف غير حجة. وذهب جمهور الفقهاء منهم الأئمة أبو حنيفة ومالك وأحمد فى إحدى الروايتين عنه إلى أن الإرسال لا يضر، فالمرسل عندهم حجة يعمل به. [أثر الحديث الشريف فى اختلاف الأئمة الفقهاء:۲۲،دار السلام للطباعة و النشر،ط:۱۴۰۷ھ]

پس مرسل فقہاء کے اُصول پر ثابت ہے، محدثین کے اُصول پر ثابت نہیں۔

اور جو صحیح خبر واحد دلیل اقوی کے معارض ہو، وہ فقہاء کے اصول پر ثابت نہیں، محدثین کے اصول پر ثابت ہے۔ حنفی اصولیین اسے انقطاع اور عدم اتصال کی ایک صورت قرار دیتے ہیں اور اسکا نام انقطاع باطن رکھتے ہیں۔ جیسے مثلا ایک گواہ اور ایک قسم سے فیصلہ کرنے کی حدیث۔ صحیح خبر واحد ہے اور حدیث مشہور (باصطلاح اصولیین) گواہ مدعی کے ذمے اور قسم منکر پر ہے، کے خلاف ہے۔ [نور الانوار:۱۸۴،۱۸۵، ملخصاً]

اصطلاح میں اختلاف کی ایک اور دلچسپ اور اہم مثال ملاحظہ ہو۔

قال اللكنوى: قال صالح بن مهدى المقبيلى اليمنى العلامة فى بعض مؤلفاته: إن الحديث الصحيح بالمعنى الأخص عند المتأخرين من حوالى زمن البخارى ومسلم هو ما رواه العدل الحافظ عن مثله من غير شذوذ ولا علة، وبالمعنى الأعم عند المتقدمين من المحدثين وجميع الفقهاء والأصوليين هو المعمول به.[الأجوبة الفاضلة للأسئلة العشرة الكاملة:۲۳۲،۲۳۳، ت: عبد الفتاح أبو غدة، مكتب المطبوعات الإسلامية ط:۱۴۰۴ھ]

۵.....محدثین کی زیادہ تر بحث خبر واحد کی سند سے ہوتی ہے۔ سند میں دو امر قابل لحاظ ہیں: ا۔ ثقاہت رواۃ (یعنی سب عادل وضابط ہوں)۔ ۲۔ اتصال سند۔ شذوذ وعلت درحقیقت سند کے ان دو اوصاف کی کمی ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ثقاہت واتصال کی تفصیل فقہاء کے ہاں محدثین سے مختلف ہے۔

قال ابن حجر: وإنما أبهمت شروط التواتر فى الأصل؛ لأنه على هذه الكيفية ليس من مباحث علم الإسناد، » وإنما هو من مباحث أصول الفقه « إذ علم الإسناد يبحث فيه عن صحة الحديث أو ضعفه؛ ليعمل به أو يترك من حيث صفات الرجال، وصيغ الأداء، والمتواتر لايبحث عن رجاله، بل يجب العمل به من غير بحث.

[نزهة النظر:٤٥، ت: عتر، مطبعة الصباح، دمشق :۱۴۲۱ھ]

وقال: ثم المردود: وموجب الرد إما أن يكون لسقط من إسناد، أو طعن ”من إسناد“ فى راو على اختلاف وجوه الطعن، أعم من أن يكون لأمر يرجع إلى ديانة الراوى أو إلى ضبطه. [المصدر السابق: ٨٠]

متاخرین محدثین کے ہاں حدیث صحیح کی مشہور ومعروف تعریف وہ ہے جو ابن صلاح شافعی (م ۶۴۳ھ) رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے۔

قال ابن الصلاح الشافعی: أماالحديث الصحيح: فهو الحديث المسند الذی يتصل إسناده بنقل العدل الضابط عن العدل الضابط إلى منتهاه، ولايكون شاذا،ولامعللا . وفی هذه الأوصاف احترازعن المرسل، والمنقطع، والمعضل، والشاذ، وما فيه علة قادحة، وما فی راويه نوع جرح.[مقدمة ابن الصلاح: ت: عترا/۱۱،۱۲، دارالفكرالمعاصر، بيروت ط:۱۴۰۶ھ]

اس تعریف میں بنیادی طور پر چار شرائط ہیں۔۱:اتصال سند ۲:ثقاہت رواۃ ۳:عدم شذوذ ۴:عدم علت۔اَب ذرافقہاءاوراُصولیین کی نظر سے ان شرائط کا جائزہ لیجیے۔

قال ابن دقيق العيد الشافعی: الصحيح ومداره بمقتضى أصول الفقهاء والأصوليين على صفة عدالة الراوی العدالة المشترطة فيقبول الشهادة على ما قرر من الفقه . فمن لم يقبل المرسل منهم زاد فی ذلك أن يكون مسندا .وزاد أصحاب الحديث أن لايكون شاذا ولامعللا . وفی هذين الشرطين نظر على مقتضى مذهب الفقهاء فإن كثيرا من العلل التی يعلل بهاالمحدثون الحديث لاتجری على أصول الفقهاء.

[الاقتراح فی بيان الاصطلاح:۵، دار الكتب العلمية بيروت ط: دون التاريخ]

قال ابن حجر العسقلانی الشافعی: والمصنف يأخذ بقول الفقهاء والأصوليين وذلك أنهم لايشترطون نفی الشذوذ فيشرط الصحيح. [النكت على كتاب ابن الصلاح: ۱/۱۰۶، ت: ربيع المدخلی، عمادةالبحثالعلمی، السعودية، ط:۱۴۰۴ھ]

قال ابن الجوزی الحنبلی: فالإنصاف إن الحكم بالشذوذ من المحدثين لما كان مرجعه الترجيح من حيث كثرة العدد أو قوة الحفظ ونحوهما لا يستلزم كون الحديث شاذا مردودا عند غيرهم من الفقهاء غير محتج به فی الأحكام فإن وجوه الترجيح غير محصورة فلا يبعد أن يكون الحديث المرجوح من جهة تفرد الراوی أو قصور حفظه أرجح مما يقابله من سائر جهات الترجيح. [فتح الملهم:۱/۱۳۶، ت: جماعة من المشائخ، دار إحياء التراث العربی، بيروت ط:۱۴۲۶ھ]

قال الفاضل أكرم السندی: أخذ اتصال السند فی تعريف الصحيح بناء على أنه مذهب أكثر المحدثين (بعد المائتين)، وإلا فمرسل القرون الثلاثة عند فقهائنا الحنفية حجة، وكذا المرسل حجة عند مالك والكوفيين.[ظفر الأمانی بشرح مختصر السيد الشريف الجرجانی:۱۱۰، ت: عبد الفتاح أبو غدة، مكتب المطبوعاتالإسلامية – حلب ط:۱۴۱۶ھ]

راوی کی عدالت کا مطلوبہ معیار کیا ہے؟اس میں اختلاف ہے۔

قال الشيخ محمد عوامة: أما ثبوت عدالة الراوی فههنا مهيع واسع جدا ومجال رحب للاختلاف، فقد اختلفوا فی نوعية العدالة المطلوب ثبوتها:

هل يكتفی بكون الراوی مسلما لم يثبت فيه الجرح؟ أو يشترط أن يضاف إلى ذلك ثبوت عدالته الظاهرة فيكتفی بذلك ويسمى حينئذ مستورا؟ أو لا بد من ثبوت عدالته الظاهرة

والباطنة؟ [أثر الحديث الشريف في اختلاف الأئمة الفقهاء:٢٢]

حنفیہ کے ہاں قرون ثلاثہ کے رواۃ کے لیے ثبوت عدالت میں پہلے دونوں درجے بھی کافی ہیں۔قرون ثلاثہ کا مجہول او رمستور عادل سمجھا جائے گا تاوقتیکہ اس پر جرح مفسر دلیل سے ثابت نہ ہوجائے۔قرون ثلاثہ میں عدالت اصل ہے اور ضعف محتاج دلیل۔محدثین کی ایک جماعت کے ہاں بھی مستور عادل ہے۔(دیکھیے :الرفع والتکمیل :۲۴۲-۲۴۴) تاہم جمہور مستور کو قبول نہیں کرتے۔[نزهة النظر :۱۰۲] پس ان کے ہاں ظاہرا اور باطنا عدالت کا ثبوت ضروری ہے۔حدیث صحیح کی تعریف میں عدل کی قید کا فائدہ ملاحظہ ہو:

العدل احتراز عما في سنده من لم تعرف عدالته بأن يكون عرف بالضعف أو جهل عينا أو حالا.[شرح ألفية العراقي:۱/۱۰۴، ت: عبد اللطيف، ماهر ياسين، دارالكتب العلمية، بيروت ط:۱۴۲۳ھ]

قال الزركشي: واعلم أن للمحدثين أغراضا في صناعتهم احتاطوا فيهالا يلزم الفقهاء اتباعهم على ذلك.[النكت على مقدمة ابن الصلاح:۲/۲۰۹،ت: زين العابدين،أضواء السلف]

عدالت رواۃ سے متعلق ایک اختلافی نکتہ یہ ہے کہ کونسا امر مسقط عدالت ہے؟ جیسے مثلا رائے اور فقہ کی بنا پر جرح ہوتی رہی ہے جس کا کچھ اعتبار نہیں۔ایک اور اختلافی نکتہ یہ ہے کہ عدالت کس طریقے سے ثابت ہوگی؟ مثلا تعدیل علی الابہام مقبول ہے یا نہیں؟

راوی کے ضبط کے لیے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے استمرار حفظ کی قید لگائی ہے، جبکہ جمہور محدثین کے ہاں یہ قید نہیں۔

قال الشيخ محمد عوامة: يحسن التنبيه إلى شرط في ثبوت ضبط الراوي اشترطه الإمام أبو حنيفة رحمه الله هو استمرار حفظ الراوي بحديثه من حين تحمله له إلى حين أدائه إياه دون أن يتخلله نسيان له .وهذا شرط شديد حمله عليه ما شهده من اضطراب الرواة وتصرفهم، وبحكم هذا الشرط سيختلف مع غيره في تضعيف بعض الأحاديث وتصحيح غيره لها.[أثر الحديث الشريف:٢٤] ومثله في نورالأنوار:١٨٢

مذکورہ بالا تفصیل سے محدثین اور فقہاء کے معیار ثبوت حدیث میں فرق بخوبی واضح ہوگیا۔اگر مضمون کے موضوع سے بعید نہ ہوتا تو یہاں یہ بحث بھی ذکر کی جاتی کہ حدیث صحیح کی اس مشہور تعریف میں خود متقدمین محدثین کے نقطہ نظر سے کیا تاملات ہیں؟

٦......حدیث پر عمل کرنے کے لحاظ سے محدثین کا عمومی طریقہ یہ ہے کہ صحیح مرفوع حدیث کے

ظاہری معنی لیتے ہیں۔اور جہاں احادیث میں بظاہر تعارض ہو وہاں تطبیق دیتے ہیں یا قوت سند کی بنا پر ترجیح دیتے ہیں۔دوسری طرف فقہاء کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن مجید، مرفوع احادیث، شریعت کے عام قوانین، صحابہ اور تابعین کے فتاوی اور عمل، حکم کی علت، شارع کی غرض، ثبوت اور دلالت کے لحاظ سے دلائل کے مراتب وغیرہ جملہ امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے حدیث کی عملی حیثیت متعین کرتے ہیں۔اور کئی طرح کے قرائن وشواہد کی بنا پر حدیث کے ظاہری معنی مراد نہیں لیتے۔

قال الشيخ عبد الحق المحدث: إن طريق المحدثين هو أخذ العمل بالمنصوص الذى ثبت بالنقل الضحيح أو جواز العمل بالحديث الضعيف فى فضائل الأعمال، لا سيما عند ما تتعدد الطرق وتتعاضد. وطريقة الفقهاء اعتبار المعنى وعلة الحكم قاعدة الباب باستثناء أن يقع نص فى مقابلها. [دستور العلماء:٤/١١٥، القاضى عبد النبى بن عبد الرسول الأحمد نكرى، ت: حسن يانى فحص، دار الكتب العلمية، بيروت ط:۱۴۲۱ھ]

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: محدثین کا مطمح نظر روایت ہوتی ہے اور فقہاء درایت سے کام لیتے ہیں۔جیسے غناء محدثین کے نزدیک بلا مزامیر جائز ہے، کیونکہ حدیث میں لفظ معازف کا آیا ہے اور فقہاء کے نزدیک بلا مزامیر بھی جائز نہیں، کیونکہ وہ علت کو سمجھتے ہیں اور وہ خوف فتنہ ہے اور وہ جیسے مزامیر میں ہے، صرف غناء میں بھی موجود ہے۔محدثین نص سے تجاوز نہیں کرتے اور فقہاء اصل منشا حکم کو معلوم کر کے دیگر مواقع تک حکم کو متعدی کرتے ہیں۔

[تحفۃ العلماء:۲/۵۸۶، ت: مفتی محمد زید، مکتبہ سید احمد شہید، اکوڑہ خٹک، سن ندارد]

قال كيلانى محمد خليفة: وهذه المسئلة (أى المسح على الخفين والخمار) يظهر فيها بوضوح بين نظر الفقهاء الذى يلحظ الأدلة الشرعية الأخرى ويوفق بينها عند التعارض وبين نظر المحدثين الذين يعملون بظواهر النصوص ويرمون من خالفهم بمخالفة السنة.[منهج الحنفية فى نقد الحديث بين النظرية والتطبيق:٣٤٨، تقديم: سعيد رمضان البوطى، دار السلام، مصر ط:۱۴۳۱ھ]

قال الشيخ الكوثرى: من قصر فى جمع الروايات واكتفى بخبر يعده صحيحا لا يكون وفى العلم حقه لأن الروايات تختلف زيادة ونقصا ومحافظة بالأصل، ورواية بالمعنى واختصارا، فلا تحصل طمأنينة فى قلب الباحث إلا باستعراض جميعها مع آراء فقهاء الصحابة والتابعين ومن بعدهم، فيتمكن بذلك من رد المردود وتأييد المقبول .وهذا ما فعله الطحاوى فى كتبه.[أمانى الأحبار:١/٤٧، إداره تاليفات أشرفيه، ملتان، دون التاريخ]

۷......مقصد اور طرز عمل کا یہ اختلاف، اختلاف رائے سے آگے بڑھ کر طعن وتشنیع کی حد تک بھی

پہنچا ہے۔ فقہاء نے کسی قرینے کی بنا پر حدیث کے ظاہری معنی چھوڑ کر معنائے محتمل مراد لیے تو محدثین نے اس پر مخالفت حدیث اور رائے کا طعن کر دیا۔ خصوصا حنفیہ اس ملامت کا زیادہ ہدف بنے ہیں۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہوا کہ حنفیہ کے اصول وفروع کو براہ راست انسے سمجھا نہیں گیا، دور ہی دور سے از خود سرسری طور پر دیکھا گیا اور سمجھ نہ آنے پر معاندانہ رویہ اختیار کر لیا گیا۔ نتیجۃً حنفیہ کے دلائل اور رجال کے ساتھ انصاف کم ہی ہوا۔ ورنہ جنھوں نے براہ راست ان سے سمجھا، انھوں نے صاف اعلان کر دیا کہ فقہ میں سب لوگ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالی کے محتاج ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ فقہ کی بنیاد تو حدیث ہی ہے۔

قال ابن عبد البر المالكي: كان يحيى بن معين يثنى عليه ويوثقه (أى على أبى يوسف). وأما سائر أهل الحديث فهم كالأعداء لأبى حنيفة وأصحابه.[الانتقاء فى فضائل الثلاثة الأئمة الفقهاء:۳۳۱، ت: عبد الفتاح أبو غدة، مكتب المطبوعات الإسلامية، حلب ط:۱۴۱۷ھ]

قال سليمان الطوفى الحنبلى: واعلم أن أصحاب الرأى بحسب الاضافة هم كل من تصرف فى الأحكام بالرأى، فيتناول جميع علماء الإسلام؛ لأن كل واحد من المجتهدين لايستغنى فى اجتهاده عن نظر و رأى، ولو بتحقيق المناط و تنقيحه الذى لانزاع فى صحته. أما بحسب العلمية فهو فى عرف السلف من الرواة بعد محنة خلق القرآن علم على أهل العراق. وهم أهل الكوفة أبوحنيفة ومن تابعه منهم. وبالغ بعضهم فى التشنيع عليه. وإنى والله لأرى إلا عصمتهم ما قالوا و تنزيهه عما إليه نسبوه. وجملة القول فيه إنه لم يخالف السنة عنادا، وإنما خالف فى ما خالف منها اجتهادا بحجج واضحة ودلائل صالحة لائحة، وحججه بين أيدى الناس موجودة، وقل أن ينتصف منها مخالفوه. وله بتقدير الخطأ أجر و بتقديرالإصابة أجران. والطاعنون عليه إما حساد أو جاهلون بمواقع الاجتهاد. وآخر ما صح عن الإمام أحمد إحسان القول فيه والثناء عليه، ذكره أبوالورد من أصحابنا فى كتاب أصول الدين.[شرح مختصر الروضة:۳/۲۸۹،۲۹۰ ت: عبدالله التركى،وزارةالشؤون الإسلامية،السعوديةط:۱۴۱۹ھ]

قال الجديع: ومن قبيح ما سودت به صحف كثيرة ما وقع من نقمة جماعة من أهل الحديث على أبى حنيفة وأصحابه بسبب المذهب كما قال يحيى ابن معين: أصحابنا يفرطون فى أبى حنيفة وأصحابه. فقيل له أ كان يكذب؟ فقال: كان أنبل من ذلك. أخرجه ابن عبد البر فى بيان العلم: رقم: ۲۱۰۶ وإسناده صحيح. قلت (الجديع): وتلك الصحف التى سودت بها صحف كثيرة لا تعود فى التحقيق إلا إلى التحامل بسبب خلاف

المذهب. [تحرير علوم الحديث: ١/ ٥٢٣، مؤسسة الريان، بيروت ط: ١٤٢٤ه]

حضرت تقی لکھتے ہیں: دوسرے ہر عالم کی طرح علامہ کوثری رحمہ اللہ کی بعض باتوں یا ان کے اسلوب بیان سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے ان مظلوم اہل علم (حنفیہ واشاعرہ) کے دفاع کا فرض کفایہ ادا کیا ہے، جن پر کسی معقول وجہ کے بغیر تضلیل اور طعن و تشنیع کی بارش کی گئی۔ [نقوش رفتگاں: ۳۹۰، مکتبہ معارف القرآن، کراچی۔ط: ۱۴۲۷ھ]

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: مذہب حنفی کو بعضے نادان حدیث سے بعید سمجھتے ہیں، مگر مذہب میں اصل چیز اُصول ہیں، سو ان کے اصول کو دیکھا جائے تو سب مذاہب سے زیادہ اقرب الی الحدیث ہیں...... میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ حنفیہ کے اُصول پر نظر نہ کرنے کی وجہ سے ان کو ہمیشہ بدنام کیا گیا ہے۔

[ملفوظات حکیم الامت: ۹۲/۵، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، ط: ۱۴۲۹ھ]

قال محمد بن سماعة: كان عيسى بن أبان يصلى معنا الصبح، و كنت أدعوه أنى اتى مجلس محمد بن الحسن، فيقول: هؤلاء قومى خالفون الحديث .وكان عيسى حسن الحفظ للحديث .فصلى معنا يوما الصبح وكان يوم مجلس محمد، فلماًفارقه حتى جلس فى المجلس . فلما فرغ محمد أدنيته إليه وقلت: هذا ابن أخيك أبان بن صدقة الكاتب، ومعه ذكاء ومعرفة بالحديث، وأنا أدعوه إليك فيأبى ويقول: إنا نخالف الحديث. فأقبل عليه محمد وقال له: يا بنى! ماالذى رأيتنا نخالفه من الحديث؟ لاتشهد علينا حتى تسمع منا . فسأله يومئذ من خمسة وعشرين بابا من الحديث، فجعل محمد بن الحسن يجيبه عنه اويخبره بما فيها من المنسوخ، ويأتى بالشواهد والدلائل . فالتفت إلى بعد ماخرجنا فقال: بينى وبين النور ستر فارتفع عنى، ماظننت أن فى ملك الله مثل هذا الرجل يظهره للناس .ولزم محمد بن الحسن لزوما شديدا حتى تفقه.

[أخبارأبى حنيفة وأصحابه: ١/ ١٣٢، عالم الكتب، بيروت ط: ۱۴۰۵ھ]

قال الشيخ عبد الحق المحدث الدهلوى: ومن أسباب وقوع الناس فى هذا التوهم وصدور نسبة مخالفة الأحاديث إلى مذهب الحنفية منهم، أن بعض المحدثين الذين كانوا فى مذهب الشافعى كصاحب المصابيح والمشكاة وأمثالهما من أهل العجلة والغلاة تصفحوا وتتبعوا دلائل مذهبهم وأوردواها فى كتبهم وسلكوا فى الأحاديث التى تمسك بها الحنفية طريق الطعن والجرح فى رواتها الحنيفة .وأكثر الشافعية المتأخرين عفا الله عنهم لا يخلون عن التعصب بهذا الإمام ولا يثبت أقدامهم على طريق الإنصاف فى هذا المقام (ومعلوم تعصب اليهقى والنووى وابن حجر مثلا، وللبسط موضع آخر .طارق)، والحال أن

ههنـا أحـاديـث أخر فوق ما ذكروه معارضة لها راجحة عليها أو ناسخة لها .وقد ثبت ذلك بـالـنظر فى الكتب المصنفة فى مذهبنا هنالك......ولما كنت أقرء كتاب المشكاة ووقعت فى هـذا الـخيـال وهـمـمـت أن أدخـل فى مذهب الشافعى فى الحال فعرضت ذلك على سيدى الشيـخ العالم العامل أبى المواهب صفى الدين عبد الوهاب المتقى القادرى الشاذلى، قال من أيـن وقـعتـم فـى هذا الخيال؟ لعله حملكم عليه قرائة المشكاة بالاستعجال .وقال: ما هو إلا أنهـم تتبعـوا الأحـاديـث الموافقة لمذهبهم فأوردوها فى كتبهم مكررة. وههنا أحاديث أخر راجـحة عـليهـا يثبـت مذهبنا مقررة كما مر.[فتح الرحمن فى إثبات مذهب النعمان :۲۵،۲۶، ت: المفتى نظام الدين الأعظمى، عتيق إكادمى، ملتان ط: دون التاريخ]

لطیفہ: استاذ محترم حضرت مولانا محمد محسن گلزار دام ظلہ فرماتے ہیں کہ حضرت مولانا شیخ عبدالمالک دام ظلہ نے فرمایا کہ حافظ ابن حجر درایہ میں جہاں لـم اجـده (یہ حدیث مجھے نہیں مل سکی۔) فرماتے ہیں، وہ دراصل لم اجِدّہ ہوتا ہے۔(یعنی میں نے تلاش کی زیادہ کوشش نہیں کی)۔

۸...... طالب علم اور باحث پر لازم ہے کہ ان دونوں جماعتوں کی اصطلاحات اور قواعد مستحضر رکھے اور دونوں کو اپنے اپنے درجے پر رکھے، تاکہ علم وبحث کا حق ادا ہو۔

۹......عمل بالحدیث سب ائمہ کی مشترک میراث ہے۔البتہ عمل کے انداز اور طریقے میں کچھ فرق ہے۔کوئی ظاہری معنی تک رہتا ہے، تو کوئی اس سے آگے بڑھ کر غرض اور مراد کا کھوج لگاتا ہے۔اجتہادی اختلافات کو اپنی حدود میں رکھنا ضروری ہے، ورنہ مسلمانوں کی وحدت پارہ پارہ ہوجائیگی۔

۱۰......سب ائمہ کے ساتھ ادب اور حسن ظن لازم ہے۔

عباسی خلیفہ مامون الرشید کے پاس عیسی بن ہارون آیا اور کہا کہ میں نے اس کتاب میں احادیث جمع کی ہیں جو آپ کے ساتھ ان محدثین سے سنی ہیں جنھیں ہارون الرشید نے آپ کے لیے منتخب کیا تھا۔اب آپ کے مصاحب وہ لوگ ہوگئے ہیں جو ان حدیثوں کی مخالفت کرتے ہیں (مراد اصحاب ابی حنیفہ)۔اگر یہ لوگ حق پر ہیں تو آپ کے والد نے غلط اساتذہ کا انتخاب کیا اور اگر آپ کے والد نے صحیح اساتذہ کا انتخاب کیا تو آپ ان لوگوں کو اپنی مجلس سے نکال دیں۔مامون نے کتاب لے لی اور کہا ہوسکتا ہے ان لوگوں کے پاس دلیل ہو، میں ان سے پوچھتا ہوں۔مامون نے یکے بعد دیگرے تین آدمیوں کو وہ کتاب پیش کی، مگر کوئی شافی جواب نہ دے پایا۔عیسی بن ابان کو واقعہ معلوم ہوا، اس سے پہلے یہ مامون کے پاس نہ جاتے تھے۔آپ نے کتاب الحجۃ الصغیر لکھی۔اس میں پہلے تو حنفیہ کے اصول حدیث کی پوری وضاحت کی اور پھر عیسی بن ہارون کے اعتراضات کے جوابات میں اپنے دلائل مفصل طور پر بیان کیے۔مامون نے کتاب پڑھ کر کہا: ان

کو لوگوں کو ایسا ہی جواب دینا چاہیے تھا۔ پھر یہ شعر پڑھے:

حسدوا الفتی إذ لم ینالوا سعیہ فالناس أعداء لہ وخصوم

کضرائر حسناء قلن لزوجھا حسدا وبغیا إنہ لدمیم

[أثر الحدیث الشریف: ۲۵، ۲۶، ملخصا]

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: اختلافی مسائل میں متاخرین نے بڑا جھگڑا پھیلا دیا۔ دین کو اچھا خاصا میدان جنگ بنا دیا۔ اختلاف مذاہب کو اختلاف عمل بنالیا۔

[ملفوظات حکیم الامت: ۳/ ۲۱۱، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان۔ ط: ۱۴۲۳ھ]

اور فرماتے ہیں: اگر کسی مسئلہ میں (دو حدیثوں میں) اختلاف ہو اور ناسخ و منسوخ کا حال معلوم نہ ہو تو اس میں ایک جانب کے حرام ہونے کا قطعی حکم نہ کرنا چاہیے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ شارع کی رائے میں خدا جانے کیا مطلب ہے، جس نے اس حکم کو حرام سمجھا ہے شاید شارع کا مقصود اس کے خلاف ہو۔ اسی وجہ سے سلف نے بہت وسعت کو اختیار کیا ہے اور بعض متاخرین نے بہت تشدد کیا ہے۔ ایک جانب کے قطعا حرام ہونے کا حکم کر دیا ہے۔ ایسے ہی بعض متعصبین کا طریقہ ہے کہ جس جگہ پر دو حدیثوں میں تعارض ہو اور ایک حدیث پر خود عمل کر رہے ہیں تو دوسری حدیث میں کچھ نہ کچھ قباحت گھڑ کر نکال دی تا کہ ہمارے مذہب کا ثبوت قوی ہو جائے، اس کا باعث فقط تعصب ہے۔ یہ لوگ یہ خیال نہیں کرتے کہ یہ بات کہاں تک پہنچتی ہے؟ ان کی اس کاروائی سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام میں بھی بد مذہبی تھی۔ معاذ اللہ۔ پھر آگے یہ بات رسول اللہ ﷺ تک پہنچتی ہے۔

حضرات سلف کا طریقہ یہ تھا کہ جب دو حدیثوں میں تعارض ہوا اور ان میں سے کسی کا منسوخ ہونا معلوم نہ ہوا تو بلا تعصب شہادت قلب سے جس حدیث کو راجح پایا اس پر عمل کر لیا، اور دوسرے کو بھی اس عنوان سے حکم بتا دیا کہ ہماری سمجھ میں ایسا آتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ متقدمین نے احادیث کے معنی سمجھنے کا قصد کیا ہے اور بعض متاخرین نے ظاہری لفظوں سے تمسک کر کے اور اس سے گنجائش نکال کر اس کا اتباع کیا ہے، ہمیشہ لفظ کا جواب لفظ سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر دیتے رہے، یہ اثر ہے ان کے تعصب کا......اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حدیث میں نہ تعارض ہے اور نہ معنی میں اغلاق ہے، مگر پھر بھی ظاہری مدلول کیخلاف یوں فرماتے ہیں کہ ہماری سمجھ میں اس حدیث کے یہ معنی آتے ہیں جو ظاہر میں مستبعد معلوم ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالی نے ان حضرات کو نور معرفت اور کشف بصیرت عنایت فرمایا تھا، جہاں حدیث سنی فورا جناب رسول اللہ ﷺ کے مقصود پر ذوقا مطلع ہو گئے۔ مثلا جناب رسول اللہ ﷺ نے بوقت وفات صاحب زادی کے فرمایا تھا کہ

ان کو تین یا پانچ یا سات بار غسل دو تو امام مالکؒ نے حدیث سنتے ہی فرمایا کہ مراد حصول تطہیر ہے، خواہ تین بار میں حاصل ہو جائے یا پانچ بار میں یا سات بار میں، اور وہ اس مطلب پر کشف بصیرت سے مطلع ہو گئے۔

ہمارے امام اعظمؒ پر لوگوں نے بہت سے اعتراض کیے ہیں کہ امام صاحب نے حدیث کو نہیں سمجھا۔ سو اصل یہ ہے کہ امام صاحب نے حقائق ومعانی احادیث کو خوب سمجھا ہے اور الفاظ ظاہری معنی پر دلالت کرتے ہیں، ان الفاظ کا مغز اور مقصود اصلی تو تامل وتدبر سے ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ پس ظاہر پرست لوگوں نے ظاہری معنی خلاف مقصود دیکھ کر اعتراضات شروع کیے، اور اگر بصیرت اور تامل سے انکی رسائی اس درجہ تک ہو جاتی جہاں تک کہ امام صاحب کی نظر دقیق پہنچی تو وہ مقصود اور مطلوب بالکل واضح اور ظاہر حدیث کے مطابق نظر آتا......امام صاحب ان حضرات کے مشابہ ہیں جنھوں نے حدیث بنی قریظہ کے مقصود معنی سمجھے اور بعضے مجتہدین ان کے مشابہ ہیں جنھوں نے ظاہری معنی سمجھے......اگر دونوں حضرات سے اس تعیین مقصود پر دلیل طلب کی جائے تو کیا بیان کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں بیان کر سکتے، کیونکہ یہ امر ذوقی اور ثمرہ بصیرت ہے......اس زمانہ میں جو اختلافات واقع ہو رہے ہیں وہ تین قسم کے ہیں: ایک تو اولی اور غیر اولی میں۔ دوسرے واجب اور غیر واجب اور تیسرے حرام اور غیر حرام۔ سو اول میں تو پڑنا فضول ہے، مثلا امام صاحب کہتے ہیں آمین بالجہر نہ چاہیے اور دوسرے لوگ آمین بالجہر کرتے ہیں، تو اس میں تو کوئی مہتم بالشان اختلاف نہیں، اور باقی قسموں میں بھی انصاف اور نرمی سے کام لینا چاہیے۔[تقریر ترمذی: ۴۳–۴۵، ملخصا بتغيير يسير، ت: مفتی عبد القادر، مفتی تقی عثمانی، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان ط: ۱۴۲۶ھ]

قال التاج السبكي: ينبغي لك أيها المسترشد أن تسلك سبيل الأدب مع الأئمة الماضيين، وأن لا تنظر إلى كلام بعضهم في بعض إلا إذا أتى ببرهان واضح .ثم إن قدرت على التأويل وتحسين الظن فدونك وإلا فاضرب صفحا عما جرى بينهم .فإنك لم تخلق لهذا فاشتغل بما يعنيك ودع ما لا يعنيك ولا يزال طالب العلم نبيلا حتى يخوض فيما جرى بين الماضين .وإياك ثم إياك أن تصغي إلى ما اتفق بين أبي حنيفة وسفيان الثوري أو بين مالك وابن أبي ذئب أو بين أحمد بن صالح والنسائي أو بين أحمد بن حنبل والحارث المحاسبي وهلم جرا، فإنك إذا اشتغلت بذلك خفت عليك الهلاك، فالقوم أئمة أعلام ولأقوالهم محامل وربما لم نفهم بعضها فليس لنا إلا الترضي عنهم والسكوت عما حرى بينهم كمما يفعل فيما جرى بين الصحابة رضي الله عنهم.

[الرفع والتكميل: ۴۲۵–۴۲۹، ت: عبد الفتاح أبو غدة، قديمي، كراتشي، دون التاريخ]

۲۲/نومبر ۲۰۱۹م/۲۴/ربیع الاول ۱۴۴۱ھ

مولانا مجیب الرحمٰن، ڈیرہ اسماعیل خان

غامدی صاحب کے مزعومہ اجتہادات پر ایک نظر

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم وعلی آله وصحبهٖ اجمعین. امابعد!

دینی عقائد ومسائل میں تحقیق ایک اچھا عمل ہے، ہر دور میں اصحابِ صلاحیت مختلف پہلو سے تحقیقات میں مشغول رہے ہیں اور رہتے ہیں، لیکن نبی کریم ﷺ کے بعد حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مجموعی حیثیت سے قرآن مجید سمجھنے میں جتنی اہلیت حاصل تھی وہ تابعین میں مستقلاً نہیں مانی جاسکتی، اور تابعین کو جو صلاحیت حاصل تھی وہ تبع تابعین میں اور تبع تابعین کو جو حاصل تھی وہ اُن کے بعد والوں میں نہیں مانی جاسکتی، انفرادی معاملہ جدا ہے کہ کبھی کوئی تبع تابعی اجتہادی صلاحیت میں کسی تابعی کے برابر ہوگیا یا بڑھ گیا، اسی طرح دیگر طبقات میں بھی۔

ہم اپنے دینی اعمال وعقائد حاصل کرنے میں صحابہ رضی اللہ عنہم تابعین تبع تابعین وائمہ مجتہدین رحمہم اللہ کے محتاج ہیں۔

والذین اتبعوهم باحسان (صحابہ کرام کے بعد) وہ بھی کامیاب ہوں گے جو اخلاص کے ساتھ اُن حضرات کی پیروی کریں گے۔

فان اٰمنوا بمثل ما اٰمنتم بهٖ فقد اهتدوا. اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح ایمان اختیار کریں گے تو تب ہدایت پائیں گے۔

اس لیے عقائد واعمال میں اُن حضرات سے الگ راہ اختیار نہیں کی جاسکتی، جو اختیار کرے وہ صراط مستقیم پر نہیں ہوسکتا۔

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الهدیٰ ویتبع غیر سبیل المؤمنین نوله ما تولی ونصله جهنم. ہدایت واضح ہوجانے کے بعد جو رسول کریم ﷺ کی مخالفت کرے گا اور مسلمانوں کا راستہ چھوڑ کر چلے گا جدھر کو پھرے گا اُدھر کو ہم پھیر دیں گے اور پھر جہنم میں داخل کریں گے۔

صراط الذین انعمتَ علیهم. اُنہی لوگوں کا راستہ صراط مستقیم (سیدھا راستہ) ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا۔

من النبیین والصدیقین والشهداء والصالحین. وہ انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور اولیاء

لوگ ہیں جن پر اللہ تعالی نے انعام فرمایا ہے۔

اُصول سب نبیوں کے ایک تھے، عقائد میں توحید، رسالت، قیامت، اور اعمال میں نماز، روزہ، زکوۃ، حج وغیرہا سب کے ہاں تھے، فروع اور جزئیات میں فرق رہا ہے، مگر وہ اُصول عقائد واعمال حضور ﷺ کی امت کو حضور ﷺ کے ذریعے معلوم ہوئے، اس لئے اب یہ امت اُصول عقائد واعمال میں بھی نبی کریم ﷺ کی محتاج ہے، آپ ﷺ سے ہی اُصول وعقائد واعمال لے گی جیسا کہ فروع وجزئیات نبی کریم ﷺ سے لے گی، اور اُن عقائد واعمال کو اِس نظریہ کے ساتھ نہیں اختیار کرے گی کہ یہ اصل اور عقیدہ وعمل حضرت آدم، نوح، ابراہیم، موسی، عیسی وغیرہم علیہم السلام نے دیا بلکہ اِس لحاظ سے اختیار کرے گی کہ یہ نبی کریم ﷺ نے (اللہ تعالی سے لے کر) دیا ہے، اور یہ نئی وحی اور شریعت ہے، گو یہی عقیدہ وعمل سابقہ انبیاء علیہم السلام کا بھی تھا، اس لئے نبیین میں سے نبی کریم ﷺ کی ہدایات کو لینا ہے۔

اور صدیقیت وشہادت وصالحیت جیسی یہ صفات مجموعی طور پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں پائی گئیں، پھر درجہ بدرجہ تابعین، تبع تابعین، ائمہ مجتہدین میں پائی گئیں، اس لئے اَب اِن حضرات کے عقائد واعمال کو اختیار کرنا صراط مستقیم ہے، اُس سے ہٹنا گمراہی ہے۔

دورِ حاضر میں جدید محققین کی بہتات ہے، وہ اپنی تحقیقات میں بہت دفعہ اِن اسلاف سے کٹ جاتے ہیں، ایسی تحقیق جس کے سبب آدمی اسلاف سے کٹے، درست نہیں ہوسکتی اگرچہ کیسی ہی خوب صورت لگے، جدید محققین میں سے ایک جاوید احمد غامدی صاحب ہیں۔

جاوید احمد غامدی صاحب کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے کو درجہ اجتہاد پر فائز سمجھتے ہیں، چنانچہ کہتے ہیں:

”میں اپنے آپ کو طالب علم سمجھتا ہوں جہاں تک اجتہاد کا تعلق ہے یہ ہر دور کے انسان کی ضرورت ہے، جن معاملات میں اللہ تعالی نے یا پیغمبر نے کوئی حکم نہیں دیا اُن میں اجتہاد ہی کریں گے اور کیا کرسکتے ہیں، یہ اجتہاد آپ بھی کرتے ہیں، میں بھی کرتا ہوں، ہر آدمی اپنے لحاظ سے کرتا ہے۔“[قومی ڈائجسٹ اکتوبر ۲۰۰۸ء صفحہ:۳۳]

”کتاب وسنت کی تعبیر وتشریح کا حق ہر اُس شخص کو حاصل ہے جو اپنے اندر اِس کی اہلیت پیدا کرلے، جو لوگ ہم سے پہلے آئے وہ بھی انسان تھے اور ہم بھی انسان ہیں۔“[برہان:۳۷]

غامدی صاحب مطالعہ کافی رکھتے ہیں، ذہین بھی بہت ہیں، اِس لیے اپنے بہت سے اجتہادات میں ائمہ اربعہ مجتہدین تک سے اختلاف کرتے ہیں، کئی تعبیرات میں بھی اسلاف سے مختلف موقف رکھتے

ہیں، اُنہوں نے اپنی سوچ سے کئی اُصول بنائے اور پھر اُن اصولوں پر اپنے اجتہادات کی عمارت کھڑی کی ہے، اپنی ہر بات کو مدلّل طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارا اِرادہ ہے کہ اُن کی تحریرات سامنے رکھ کر اُن کے اصولوں اور اجتہادات پر سوچ و بچار کی جائے، اور جو باتیں درست نہ لگیں اُن سے متعلق کچھ معروضات عرض کردی جائیں۔ واللہ المؤفق

غامدی صاحب کا تصورِ سنت

سنت دین ابراہیمی کی روایت ہے، اور وہ صرف درج ذیل چیزیں ہیں:

جناب غامدی صاحب کہتے ہیں:

”رسول اللہ ﷺ سے یہ دین آپ کے صحابہ کے اجماع اور قولی و عملی تواتر سے منتقل ہوا، اور دو صورتوں میں ہم تک پہنچا ہے: ۱: قرآن مجید، ۲: سنت، ......سنت سے ہماری مراد دینِ ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اُس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے، قرآن میں آپ کو ملتِ ابراہیمی کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے، یہ روایت بھی اُسی کا حصہ ہے......اس ذریعے سے جو دین ہمیں ملا ہے وہ یہ ہے، عبادات [نماز، زکوۃ اور صدقہ فطر، روزہ و اعتکاف، حج وعمرہ، قربانی اور ایّام تشریق کی تکبیریں] معاشرت [نکاح وطلاق اور اُن کے متعلقات، حیض و نفاس میں زن و شوہر کے تعلق سے اجتناب] خورد و نوش [سود، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کئے گئے جانور کی حرمت، اللہ کا نام لے کر جانوروں کا تذکیہ] رسوم وآداب [اللہ کا نام لے کر اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا، ملاقات کے موقع پر السلام علیکم، اور اُس کا جواب، چھینک آنے پر الحمدللہ، اور اُس کے جواب میں یرحمک اللہ، مونچھیں پست رکھنا، زیرناف کے بال کاٹنا، بغل کے بال صاف کرنا، بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا، لڑکوں کا ختنہ کرنا، ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی، استنجاء، حیض و نفاس کے بعد غسل، غسلِ جنابت، میت کا غسل، تجہیز و تکفین، تدفین، عید الفطر، عید الاضحٰی۔

سنّت یہی ہے، اور اِس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اِس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں ہے، وہ جس طرح صحابہ کے اجماع اور قولی تواتر سے ملا ہے، یہ اسی طرح اُن کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے، اور قرآن ہی کی طرح ہر دور میں مسلمانوں کے اجماع سے ثابت ہوتی ہے، لہٰذا اس کے بارے میں اب کسی بحث و نزاع کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے، دین لاریب اِنہی دو صورتوں میں ہے، اِن کے علاوہ کوئی چیز (نہ) دین ہے، نہ اُسے دین قرار دیا جاسکتا ہے۔“ [میزان صفحہ ۱۳، ۱۴، ۱۵]

اِس ساری عبارت کا حاصل یہی ہوا کہ سنّت دینِ ابراہیمی ہے جو بروایت رسول کریم ﷺ ہم

تک پہنچی، ہاں رسول کریم ﷺ نے اُس میں بعض اضافے بھی فرمائے ہیں، اور وہ بھی سنّت ہیں، اِس کا مطلب یہ ہوا کہ رسولِ کریم ﷺ دراصل دینِ ابراہیمی کے راوی ہیں اور بس، ہاں! ضمناً کچھ معمولی اضافے فرمائے ہیں، لیکن اصل اضافے نہیں ہیں، وہ تو ضرورت پڑنے پر بالتبع بڑھانے پڑے، ورنہ اصل وہی دینِ ابراہیمی ہے، اس لحاظ سے نبی کریم ﷺ مستقل رسول اور نبی نہیں رہتے محض دینِ ابراہیمی کے مجدّد و مصلح کی حیثیت کے نبی رہتے ہیں۔

رہا یہ اِشکال کہ جب خود نبی کریم ﷺ کو اور آپ ﷺ کی امت کو ملتِ ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کا حکم دیا گیا تو سنّت وہی دینِ ابراہیمی ہوا، اور حضور ﷺ اُس کو پہنچانے والے اور امت اُسی کی پیرو کار تو ہوئی؟

اصل میں حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں ملتِ ابراہیم کا ذکر ہوا اُس سے مراد وہ اُصول ہیں جو دینِ ابراہیمی میں تھے۔ (صرف بعض فروع از قبیل حج وغیرہ ایسے ہیں جن میں آپ ﷺ کو اُن کی اتباع کا حکم ہوا) تو نبی کریم ﷺ کو اور آپ ﷺ کی امت کو اُنہی اُصول کی پیروی کی ترغیب دی گئی ہے، چنانچہ علامہ محمد بن علی [یا اعلیٰ] ابن القاضی حنفی تھانوی (م بعد ۱۱۵۸ھ) رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”الملة بالكسر وتشديد اللام فی الكشف هی والطريقة سواء وهی فی الاصل اسم من امللتُ الكتاب بمعنی امليتُهٗ كماقال الراغب ومنه طريق مملول مسلوك معلوم كمانقله الازهری ثم نقل الی اصول الشرائع باعتبار انها يمليها النبی ﷺ ولايختلف الانبياء عليهم السلام فيها.“[كشاف اصطلاحات الفنون : ۱۶۳۹/۲]

مِلّت اور راستہ ایک برابر ہیں (ایک چیز ہیں) مِلّت اصل میں **امللتُ الكتاب** سے ہے، بمعنی میں نے کتاب املاء کرائی جیسا کہ امام راغب نے فرمایا ہے، اور اِسی لفظ سے **طريق مملول** ہے، یعنی چلا ہوا معلوم راستہ، جیسا کہ ازہری نے نقل کیا ہے، پھر مِلّت کا لفظ شریعتوں کے اُصول کی طرف نقل ہو گیا اس اعتبار سے کہ اُن کو نبی املاء کراتے ہیں، اور اُن میں انبیاء علیہم السلام میں اختلاف نہیں ہوتا۔

بل نتبع ملّة ابراهيم التی هی التوحيد عن الاصم.[تفسير الرازی:۷۱/۴]

ملتِ ابراہیم سے مراد توحید ہے۔

عبادة الله وترك الاوثان هی ملة ابراهيم فاماتفاصيل الشرائع فلاتعلق لها بهٰذا الموضع. [الرازی :۲۵۶/۲۳] ملت ابراہیم سے مراد اللہ کی عبادت اور بتوں کو چھوڑنا ہے **(ثم اوحينااليك ان اتبع ملة ابراهيم حنيفا)** آیت کے ساتھ احکام کی تفصیلات کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

والصحیح الاتباع فی عقائد الشرع دون الفروع.[تفسیر القرطبی :۱۹۸/۱۰] اتباع ملتِ ابراہیمی سے مراد میں صحیح قول یہ ہے کہ عقائد شرعی میں اتباع مراد ہے فروع میں اتباع مراد نہیں۔

ان اتبع ملة ابراهيم حنيفا في التوحيد والدعوة اليه بالرفق ...[تفسير البيضاوي :۲۴۴/۳] ملتِ ابراہیمی کی اتباع کے حکم سے مراد توحید میں اور توحید کی طرف نرمی سے دعوت دینے میں اتباع ہے۔

وقال الامام قال قوم ان النبیﷺ كان على ملة ابراهيم وشريعته وليس له شرع متفرد به بل بعث عليه الصلاة والسلام لاحياء شريعة ابراهيم لهٰذه الاية فحملوا الملة على الشريعة اصولاً وفروعاً وهو قول ضعيف والمراد من ملة ابراهيم التوحيد ونفی الشرك.[روح المعانی:۲۵۱/۱۴]

امام رازی کہتے ہیں کہ: کچھ لوگوں نے کہا کہ نبی کریمﷺ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت وشریعت پر تھے، آپﷺ کی الگ مستقل شریعت نہیں تھی، یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ آپﷺ شریعت ابراہیمی کے احیاء کے لئے مبعوث ہوئے، تو اِن لوگوں نے ملت کو ساری شریعت کے معنی پر محمول کیا، اُصول ہوں یا فروع، مگر یہ کمزور قول ہے، صحیح یہ ہے کہ ملتِ ابراہیم سے مراد توحید ہے اور شرک کی نفی ہے۔

اِس بارے میں دوسری عبارات بھی بکثرت ہیں، اِن سب عبارات سے صاف عیاں ہے کہ ملتِ ابراہیمی کی اتباع سے مراد اُصول میں اُن کی اتباع ہے، اور یہ بات پہلے ذکر ہوگئی ہے کہ اصول سب انبیاء کی شریعتوں میں مشترک تھے۔

یہاں پر یہ سوال ہوسکتا ہے کہ پھر اُن اصول کی پیروی کے حکم میں خصوصاً ملتِ ابراہیم کی پیروی کا عنوان کیوں دیا گیا؟ جی ہاں! وہ عرب کو مانوس کرنے کے لئے کہ تم ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہو، وہ تمہارے دادا تھے، وہ توحید پرست تھے، تم نے کیوں بت پرستی کی راہ اختیار کی ہے؟

اور اس لئے بھی یہ عنوان اختیار کیا گیا کہ عرب جو بھی غلط رسم اختیار کرتے یا شرک کرتے اُس کی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کرتے تھے تو اُنہی سمجھانا مقصود تھا کہ تم یہ سب کام غلط کرتے ہو، اور اِن رسموں اور کاموں کی نسبت ابراہیم علیہ السلام کی طرف غلط کرتے ہو، نہ اُن کے یہ کام تھے، نہ ہی وہ شرک کرنے والے تھے، بہر حال یہ ہے غامدی صاحب کے مطابق سنّت کا مفہوم۔

غامدی صاحب مزید کہتے ہیں:

’’پہلا اُصول یہ ہے کہ سنت صرف وہی چیز ہو سکتی ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے دین ہو، قرآن اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالی کے نبی اُس کا دین پہنچانے ہی کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔الخ‘‘

[میزان:۵۷]

اوپر غامدی صاحب کا بیان کردہ دین ذکر ہو گیا ہے، یعنی بس ملتِ ابراہیمی کے چار قسم کے اعمال عبادات، معاشرت، خورد و نوش اور رسوم و آداب، یہاں حصر کے ساتھ کہا ہے کہ صرف وہی دین ہے اور وہی سنت ہے اور نبی کریم ﷺ صرف اُنہی کو پہنچانے کے لئے مبعوث ہوئے، اور صرف وہی دین پہنچایا، آپ ﷺ کا علم و عمل بس وہی تھے، اُن کے علاوہ کسی چیز سے دلچسپی ہی نہیں تھی، اور لوگوں سے بس اِنہی باتوں کا مطالبہ کرتے رہے۔[میزان:۵۷]

اِسی کو غامدی صاحب دوسرے الفاظ میں یوں لکھتے ہیں:

’’سنت قرآن کے بعد نہیں بلکہ قرآن سے مقدّم ہے۔‘‘ [میزان:۴۷]

یہی بات اہل حق بھی کہتے ہیں اور غامدی صاحب بھی کہتے ہیں مگر اہل حق کی مراد میں اور غامدی کی مراد میں فرق ہے، اہل حق کی مراد یہ ہے کہ قرآن مجید اُس وقت تک نہیں مانا جا سکتا جب تک سنت وحدیث کو نہ مانا جائے، سنت وحدیث نبی کریم ﷺ کی زبان وعمل سے صادر ہوتے ہیں، یہ بھی تو نبی کریم ﷺ نے اپنی زبان سے بیان فرمایا کہ یہ قرآن مجید ہے، یہ قرآن مجید کی آیت ہے، تو اس لحاظ سے نبی کی حدیث وسنت قرآن سے مقدّم ہے۔

مگر غامدی کی مراد یہ ہے کہ سنت وہ ہے جو قرآن مجید کے اترنے سے بھی پہلے جاری ہو چکی تھی، یعنی دینِ ابراہیمی جس کی قرآن مجید کے ذریعے حفاظت ہو گئی ہے، ورنہ سنت قرآن مجید کے بعد وجود میں نہیں آئی۔

غامدی صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں:

’’سنت صرف اُنہی چیزوں کو کہا جائے گا جو اصلاً پیغمبر کے قول وفعل اور تقریر وتصویب پر مبنی ہیں، اور اُنہیں قرآن کے کسی حکم پر عمل یا اُس کی تفہیم وتبیین قرار نہیں دیا جا سکتا۔‘‘ [میزان:۵۹]

یعنی جو تفہیم وتبیین اور اسوۂ حسنہ ہے، وہ سنّت نہیں ہے، اُس کو سنّت نہیں کہا جائے گا، ہاں جو احکام پہلے سے جاری ہوئے ہیں اور پیغمبر ﷺ نے قول، فعل اور تقریر وتصویب کے ذریعے اُن کا سنّت ہونا ظاہر کیا بس وہی سنّت ہیں، یعنی وہی دینِ ابراہیمی جن کے مخصوص اعمال کا ذکر غامدی صاحب کے حوالہ سے ہو گیا۔(جاری ہے۔)

☆☆☆☆

بہ سلسلہ زبیر علی زئی کا تعاقب

مفتی رب نواز حفظہ اللہ

علی زئی جواب پر ایک نظر

......قسط: ۵......

زبیر علی زئی:

صحیح العقیدہ گروہ کا منہج: ۵۰۵

ان کے نزدیک سلف صالحین کے فہم کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہر وقت کتاب وسنت یعنی قرآن وحدیث کو ۵۰۶
برتری حاصل ہے اور کتاب وسنت کے مقابلے میں ہر شخص کی بات کو چھوڑ نا ضروری ہے۔ مثلاً: ۵۰۷ ۵۰۸

۱: سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ۵۰۹

جب تک میں اللہ ورسول کی اطاعت کروں تو میری اطاعت کرو اور جب میں اللہ ورسول کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت نہ کرو۔ (سیرت ابن اسحاق ص: ۱۸۱؍ وسندہ صحیح) ۵۱۰

۲: سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو کسی کے قول پر چھوڑ نہیں سکتا۔ ۵۱۱ [صحیح البخاری: ۱۵۶۳]

امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: میری ہر بات جو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صحیح حدیث کے خلاف ہو (اسے چھوڑ دو) پس نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حدیث سب سے زیادہ بہتر ہے اور میری تقلید نہ کرو۔ ۵۱۲

[آداب الشافعی و مناقبہ: ۵۱، وسندہ حسن لذاتہ]

الجواب:

۵۰۵

علی زئی صاحب نے صحیح العقیدہ گروہ کے تحت صحابہ کرام کا تذکرہ کیا۔ ہم کہتے ہیں جناب! اصحاب کو تو سبھی صحیح العقیدہ مانتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا غیر مقلدین بھی صحیح العقیدہ ہیں؟ پچھلے صفحات میں غیر مقلد علماء کے فاسد العقیدہ ہونے پر خود اُن کے اپنے لکھاریوں کے حوالے ہم نقل کر چکے ہیں۔ مزید عرض ہے کہ علمائے آل غیر مقلدیت کے عقیدوں پر ان کے اپنوں نے کڑی تنقید کر رکھی ہے یہاں تک کفر وشرک کے بہت سے فتاویٰ صادر کر چکے ہیں۔ اس کا ایک نمونہ ’’غیر مقلدین کی اپنوں پر شرک کے فتووں کی بوچھاڑ‘‘ بندہ کا مضمون دوقسطوں میں مجلّہ پیغامِ حق فیصل میں شائع ہو چکا ہے۔ اپنے ہی علماء پر غیر مقلدین کے کفریہ وشرکیہ فتاویٰ رسائل اہلِ حدیث جلد اول ودوم میں بھی موجود ہیں۔

خود علی زئی صاحب کا عقیدہ ہے کہ پچھلی امتوں کے لوگ عالم الغیب تھے۔ان کی کتاب ’’توضیح الاحکام:۱ر۸۷، ۸۸‘‘ کے حوالہ سے ان کا یہ عقیدہ ہم پیچھے نقل کر چکے ہیں۔

۵۰۶

حاشیہ:۱۴۲ر وغیرہ میں غیر مقلدین کے بہت سے حوالہ جات ہم نقل کر چکے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ غیر مقلدین کے نزدیک سلف صالحین کے فہم کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہاں تک کہ آلِ غیر مقلدیت میں ’’شیخ الاسلام اور ہیرو‘‘ کا لقب پانے والے ثناء اللہ امرتسری بھی اسلاف سے روگردانی میں پیش پیش رہے ہیں۔ثبوت کے لیے ’’الاربعین‘‘ مشمولہ ’’رسائل اہلِ حدیث [جلد اول]‘‘ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔الاربعین کے کچھ حوالے آگے حاشیہ:۵۰۷ر وغیرہ میں منقول ہوں گے ان شاءاللہ۔

علی زئی کو اعتراف ہے کہ سلف صالحین کے بقول عیدین کی زائد تکبیروں میں رفع یدین کرنا حدیث سے ثابت ہے۔[توضیح الاحکام:۱ر۴۵۶] مگر غیر مقلدین کا ایک گروہ عیدین کی زائد تکبیروں میں رفع یدین کا قائل نہیں ہے۔حوالہ جات حاشیہ:۱۲۵ر میں نقل کر چکے ہیں۔

سلف صالحین کا اول دستہ صحابہ کرام ہیں اور آگے حاشیہ:۵۰۷ر میں علی زئی صاحب کی عبارت مذکور ہوگی کہ اکٹھی تین طلاقوں کے تین ہونے پر صحابہ کرام کا اجماع ہے۔جب کہ غیر مقلدین ایک مجلس کی تین طلاق کو ایک کہتے ہیں۔

سلف صالحین تو جہاں رہے غیر مقلدین تو اجماع کی بھی پروا نہیں کرتے دیکھئے حاشیہ:۸۷ر وغیرہ

۵۰۷

غیر مقلدین کا احادیث کے ساتھ ناروا سلوک:

دیکھتے ہیں کہ صحیح العقیدہ لوگوں کی طرح غیر مقلدین کتاب وسنت کو برتری دیتے ہیں یا ان کے ساتھ ناروا سلوک برتا کرتے ہیں؟

سب سے پہلے علی زئی صاحب کے اعترافی جملے نقل کرتے ہیں۔

کفایت اللہ سنابلی ہندی غیر مقلد نے ایک روایت کو من گھڑت کہا تو علی زئی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

’’یہ تو صحیح حدیث کی تکذیب ہے۔‘‘ [علمی مقالات:۶ر۳۸۳]

علی زئی صاحب مزید لکھتے ہیں:

’’سنابلی صاحب ایسے منہج پر گامزن ہیں جس سے صحیح بخاری وصحیح مسلم کی احادیث کا ضعیف ہونا لازم آتا ہے۔‘‘ [علمی مقالات:۶ر۳۹۲]

علی زئی صاحب لکھتے ہیں:

’’سنابلی صاحب کو چاہیے کہ وہ تمنا عنادی اور بشیر احمد میرٹھی وغیرہما کی پگڈنڈیوں کو چھوڑ کر محدثین کرام کی جرنیلی شاہراہ پر گامزن ہوجائیں اور منکرینِ حدیث کے لیے چور دروازے نہ کھولیں۔‘‘

[علمی مقالات:۶/۳۹۴]

پڑھتے جائیں:

’’سنابلی صاحب کو چاہیے کہ وہ اپنے باطل اُصول کی لاج رکھتے ہوئے صحیح بخاری اور سنن ترمذی والی حدیث کو بھی موضوع اور من گھڑت قرار دیں تاکہ سبیل المجرمین واضح ہوجائے۔‘‘

[علمی مقالات:۶/۴۰۳]

’’سنابلی صاحب نے یہاں صحیح مسلم کی صحیح...حدیث ﴿واذا قرأ فانصتوا﴾ پر بھی حملہ کیا ہے۔‘‘

[علمی مقالات:۶/۴۰۶]

علی زئی صاحب یہاں یہ وضاحت بھی فرمادیتے کہ صحیح مسلم کی مذکورہ حدیث پر صرف سنابلی نے حملہ کیا ہے یا عبدالرحمٰن مبارک پوری سے لے کر ارشاد الحق اور خبیب اثری تک سب نے یہ کام سرانجام دیا ہے؟

آگے پڑھیں:

’’سنابلی صاحب نے اپنی تائید میں غلط منہج، باطل اُصول اور دوغلی پالیسی والے خبیب احمد فیصل آبادی کا حوالہ مقالاتِ اثریہ (ص۴۰۳) سے پیش کیا ہے۔ اس کا یہی جواب کافی ہے کہ یہ **استغاثة الغريق بالغريق** یعنی ڈوبتے کو ڈوبتے کا سہارا ہے۔ ہک سجادوجا کھبا واہ جوڑی بنائی یاربا!‘‘

[علمی مقالات:۶/۴۰۶]

معلوم رہے کہ خبیب احمد فیصل آبادی غیر مقلد ہے جو اپنے نام کے ساتھ ’’اثری‘‘ بھی لکھا کرتے ہیں۔

سنابلی صاحب نے امام بخاری رحمہ اللہ کا ایک قول قبول کیا، اس پر علی زئی صاحب نے یوں تبصرہ کیا:

’’امام بخاری کا یہ قول اس صحیح (حسن لذاتہ) حدیث کے خلاف ہے جس میں آیا ہے کہ کان أبو ذر بالشام زمن يزيد بن أبي سفيان ’’یعنی ابوذر رضی اللہ عنہ یزید بن ابی سفیان کے زمانے میں شام میں تھے۔‘‘ [علمی مقالات:۶/۵۸۷]

بتایئے! مذکورہ عبارت کے پیشِ نظر سنابلی نے حدیث کو برتری دی ہے یا اس کے مقابلہ میں امام بخاری رحمہ اللہ کے قول کو؟

’’واللہ! یہ سب حوالے بادلِ نخواستہ لکھے ہیں تاکہ منکرینِ حدیث کے نقوشِ قدم پر چلنے والے

سنابلی صاحب کو آئینہ دکھایا جائے۔'' [علمی مقالات: ۴۰۹/۶]
علی زئی صاحب نے سنابلی کے رد میں لکھے گئے اپنے اس مضمون میں آگے لکھا:
''اس حدیث کا مذاق اُڑاتے ہوئے معترض نے جو کچھ لکھا ہے ہم اس کا معاملہ اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔'' [علمی مقالات: ۵۹۰/۶]
ابو محمد عبداللہ اختر غیر مقلد لکھتے ہیں:
''قارئین کرام! آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ خرم صاحب نے اصولِ حدیث کو محض اپنے مطلب کے لیے جھوٹ کے سہارے اپنے خود ساختہ اصول ڈھال کر ''مدلس راوی'' کا سماع ثابت کیا ہے۔''
[ماہنامہ اشاعۃ الحدیث حضرو شمارہ: ۱۴۱، صفحہ: ۳۵]
کوئی غیر مقلد یہاں وضاحت کر دے کہ یہ خرم صاحب! علی زئی صاحب کے ممدوح ہیں یا کوئی اور؟ علی زئی صاحب لکھتے ہیں:
''دولت نگر (ضلع گجرات) میں جناب خرم ارشاد محمدی صاحب مسلکِ اہلِ حدیث کی تبلیغ اور دعوت کا عظیم کام کر رہے ہیں اور اُن کی مساعی جمیلہ سے اس علاقے میں مسلکِ حق (مسلک اہلِ حدیث) خوب پھیل رہا ہے۔'' [علمی مقالات: ۲۶۱/۳]
عبدالحق غزنوی غیر مقلد نے علی زئی کے شیخ الشیخ ر دادا اُستاد ثناء اللہ امرتسری کی تفسیر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:
''تفسیر نبوی سے کچھ سروکار ہی نہیں، اکثر تفسیر نبوی سے برخلاف تفسیر کی ہے...افسوس بظاہر دعویٰ اہلِ حدیث اور در باطن شیوۂ منکر حدیث۔'' [الاربعین: ۵ مشمولہ رسائل اہلِ حدیث جلد اول]
غزنوی صاحب آگے لکھتے ہیں:
''یہ تفسیر حدیثِ صحیح صریح اور جملہ تفاسیر اہلِ اسلام کے خلاف ہے۔'' [الاربعین: ۷]
غزنوی صاحب آگے لکھتے ہیں:
''یہ تفسیر بھی حدیث صحیح صریح اور جملہ تفاسیر اہلِ اسلام کے خلاف ہے۔'' [الاربعین: ۷]
غزنوی صاحب مزید لکھتے ہیں: ''یہ تفسیر بھی تفسیر نبوی سے خلاف ہے۔'' [الاربعین حاشیہ: ۷]
پڑھتے جائیں: ''اتباعِ اہل سنت سے تو واسطہ نہیں، تفسیر نبوی سے بھی دست بردار ہیں۔'' [الاربعین: ۱۱]
''صفحہ ۴۲۱ر آیت یوم یاتی بعض آیات ربك میں بعض آیات ربك کی تفسیر یوم الموت کے ساتھ کی ہے یہ معنیٰ بھی حدیث صحیح صریح کے خلاف ہے۔'' [الاربعین: ۱۳]
''یہ تفسیر تفسیر نبوی کے مخالف ہے۔'' [الاربعین: ۱۳ر حاشیہ]
''یہ معنیٰ بھی صریح صحیح حدیثوں اور تفسیروں معتبرہ اہل اسلام کے خلاف ہے۔'' [الاربعین: ۱۳]

’’یہ تفسیر بھی حدیث صریح کے خلاف ہے۔‘‘[الاربعین:۱۴]

’’صفحہ ۱۹۷/اِس آیت للذین احسنوا الحسنی وزیادة کی تفسیر علی قدر اعمالھم سے کرتے ہیں یعنی زیادہ سے مراد یہ ہے کہ نیکوں کو اپنے نیک عملوں سے زیادہ ثواب ملے گا اور یہ معنیٰ بھی تفسیر نبوی سے مخالف ہے کیونکہ صحیح مسلم اور احمد اور ترمذی وغیرہ کتب حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ زیادہ سے مراد دیدارِ الٰہی ہے۔‘‘[الاربعین:۱۶]

’’یہ معنیٰ بھی صریح حدیث کے خلاف ہے۔‘‘[الاربعین:۱۷]

’’افسوس ہے برخلاف آیاتِ کریمہ واجماع ائمہ کے جا بجا اپنی تفسیر میں عرش کی تفسیر بتقلید قفال حکومت اور بادشاہت کے ساتھ کرتا ہے اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ عرش کے انکار سے تو کفر تک نوبت پہنچتی ہے۔‘‘ [حاشیہ الاربعین:۱۷]

’’چونکہ اس آیت میں بھی معجزہ اور کرامت ثابت ہوتا ہے جو اس کی سمجھ میں قانون قدرت کے خلاف ہے اس واسطے آیت کی تفسیر کچھ اور کی۔‘‘[حاشیہ الاربعین:۱۸]

’’فلسفیت اور اعتزال کے مارے یہاں بھی تفسیر نبوی کا خلاف چلا۔‘‘[حاشیہ الاربعین:۱۸]

’’چونکہ مصنف تفسیر ثنائی کے نیچر کے خلاف ہے۔لہٰذا صریح حدیث سے خلاف کیا اور اس تفسیر میں ابو علی جبائی معتزلی کا مقلد ہوا۔‘‘[الاربعین:۱۹]

’’یہ تفسیر بھی حدیث صحیح صریح کے خلاف ہے۔‘‘[الاربعین:۱۹]

’’یہ تفسیر بھی تفسیر نبوی سے مخالف ہے۔‘‘[حاشیہ الاربعین:۱۹]

’’یہ تفسیر بھی تفسیر نبوی سے خلاف ہے۔‘‘[حاشیہ الاربعین:۱۹]

’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت [یثبت اللہ الذین آمنوا بالقول الثابت (ناقل)] کی تفسیر نکیر ومنکر کے سوال اور عذابِ قبر کے ساتھ کی ہے اور مصنف تفسیر ثنائی نے بتقلید فرقہ ضالہ معتزلہ بر خلاف تفسیر نبوی وہ معنیٰ کیا جس سے عذاب قبر اور سوال نکیر اور منکر ثبوت تک نہ پہنچے۔‘‘[الاربعین:۲۰]

’’یہ بھی احادیث صحیحہ اور تفاسیر معتبرہ اہلِ اسلام کے خلاف ہے۔‘‘[الاربعین:۲۰]

’’تفسیر نبوی کا خلاف ہے۔‘‘[حاشیہ الاربعین:۲۰]

’’تفسیر نبوی اور تفاسیر معتبرہ اہلِ اسلام کو چھوڑ کر ایسی چال چلے کہ جس سے معجزہ اور کرامت کا ثبوت ہی نہ ملے۔‘‘[الاربعین:۲۱]

’’یہ تفسیر بھی حدیث نبوی وتفسیر مصطفوی کے خلاف ہے۔‘‘[الاربعین:۲۱]

’’افسوس نام تو اہلِ حدیث رکھ لیا مگر تفسیر نبوی کو کہیں پسند نہیں کیا۔‘‘[الاربعین:۲۱]

''اس تفسیر نبوی کی مخالفت کا باعث وہی اس کے زعمی قانون قدرت کا خلاف ہے۔''

[حاشیہ الاربعین:۲۱]

''یہ تفسیر بھی تفسیر نبوی کا خلاف ہے۔'' [حاشیہ الاربعین:۲۱]

''مصنف تفسیر ثنائی کا اس تفسیر میں بھی تفسیر نبوی کا خلاف اور معتزلہ کا وفاق ہے۔'' [الاربعین:۲۲]

''چونکہ یہ تفسیر نبوی مصنف تفسیر ثنائی کے زعم میں خلاف قانون قدرت تھی لہٰذا اس کو چھوڑ کر معتزلہ کی چال چلا۔'' [الاربعین:۲۲]

''مصنف تفسیر ثنائی کی یہ تفسیر تفسیر نبوی اور تفسیر صحابہ اور تمام تفاسیر اہلِ اسلام کے خلاف ہے۔''

[الاربعین:۲۲]

''چونکہ تفسیر نبوی کے مطابق تفسیر کرنے سے اس کے زعمی قانون قدرت کا خلاف ثابت ہوتا تھا اس واسطے معتزلہ کا راستہ چلا۔'' [حاشیہ الاربعین:۲۲]

''تفسیر نبوی کا خلاف ہے۔'' [حاشیہ الاربعین:۲۲]

''تفسیر نبوی کا خلاف اور ابراہیم علیہ السلام کے معجزہ کا انکار۔'' [حاشیہ الاربعین:۲۳]

''تفسیر نبوی کا نام نہ لینا اور دعویٰ اہلِ حدیث کرنا جو فروشی اور گندم نمائی نہیں تو اور کیا ہے۔''

[الاربعین:۲۵]

''یہ تفسیر بھی تفسیر نبوی اور تمام صحابہ اور خیر القرون کے خلاف ہے۔'' [الاربعین:۲۵]

بیسیوں علماء نے ''الاربعین'' کتاب کی تائید کی ہے ان میں سے چند مؤیدین کے حوالے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

حکیم ابوتراب محمد عبدالحق صاحب لکھتے ہیں:

''میں نے تفسیر عربی مسمی بہ تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن جس کو مولوی ثناء اللہ امرتسری نے تصنیف کیا ہے اکثر جگہ دیکھا اور غور سے مطالعہ کیا۔ احادیث نبویہ علی صاحبها التحية اور اقوال صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین، ائمہ مجتہدین سلف صالحین اور جمہور اہلِ علم بلکہ اجماع کے برخلاف ہے۔'' [الاربعین:۳۰]

عبدالمنان وزیرآبادی صاحب کہتے ہیں:

''میں نے تفسیر عربی مصنفہ ثناء اللہ امرت سری کی مواضع متعددہ سے سُنی۔ اکثر تفسیر سلف صالحین اور خیر القرون کے خلاف ہے بلکہ اکثر موقع پر تفسیر بالرائی ہے جس کے حق میں حدیثوں میں وعید شدید آتا ہے۔'' [الاربعین:۳۲]

ہدایت اللہ امام مسجد سوداگران صدر پنڈی لکھتے ہیں:

’’یہ اغلاط جو تفسیر ثنائی سے نقل کئے گئے ہیں واقعی تفسیر نبوی اور تفسیر سلف صالحین اور مذہب اہلِ سنت و جماعت کے صریح خلاف ہیں۔‘‘ [الاربعین:۳۴]

سید نذیر حسین کے شاگرد محمد حسین ہزاروی صاحب لکھتے ہیں:

’’اس میں شک نہیں کہ یہ تفسیر نیچرانہ طریق پر لکھی گئی ہے اور سلف صالحین اور مجتہدین رحمہم اللہ اور احادیثِ صحیحہ کے برخلاف لکھی گئی ہے۔‘‘ [الاربعین:۳۸]

محمد حسین بٹالوی صاحب لکھتے ہیں:

’’توافق سنت صریحہ وآثار سلفیہ صحیحہ جو تفسیر کے لیے ایک لازمی امر ہے اُس میں یکسر مفقود ہے اور برعکس اس کے توافق مذاہب باطلہ معتزلہ نیچریہ مرزائیہ چکڑالویہ اس میں جا بجا موجود ہے۔‘‘ [الاربعین:۴۲]

عبدالواحد بن عبداللہ غزنوی صاحب لکھتے ہیں:

’’مولوی ثناء اللہ امرتسری کو خود رائی وخود بینی نے تباہ کر کے یہاں تک پہنچایا کہ اپنی رائے سے تفسیر کرتا ہے سلف صالحین تو بجائے خود رہے وہ احادیث سے بھی مستغنی ہوا۔‘‘ [الاربعین:۵۴]

اب حکیم فیض عالم صدیقی غیر مقلد کے حوالے بھی پڑھتے جائیں کہ وہ حدیثوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں!!!

حکیم صاحب احادیث بخاری کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’ان محدثین، ان شارحینِ حدیث، ان سیرت نویس اور ان مفسرین کی تقلیدی ذہنیت پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے جو اتنی بات کا تجزیہ یا تحقیق کرنے سے بھی عاری تھے کہ یہ واقعہ سرے سے ہی غلط ہے لیکن اس دینی و تحقیقی جرأت کے فقدان نے ہزاروں ایسے پیدا کئے اور پیدا ہوتے رہیں گے۔ ہمارے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح بخاری میں جو کچھ درج فرما دیا وہ صحیح اور لاریب ہے خواہ اس سے اللہ تعالیٰ کی الوہیت، انبیاء کرام کی عصمت، ازواج مطہرات کی طہارت کی فضائے بسیط میں دھجیاں بکھرتی چلی جائیں کیا یہ امام بخاری کی اسی طرح تقلید جامد نہیں جس طرح مقلدین ائمہ اربعہ کی کرتے ہیں۔‘‘

[صدیقۂ کائنات:۱۰۵]

حکیم صاحب آگے لکھتے ہیں:

’’دراصل امام بخاریؒ میرے نزدیک اس روایت کے معاملہ میں مرفوع القلم ہیں، داستان گو کی چابک دستی کے سامنے امام بخاری کی احادیث کے متعلق تمام چھان بین دھری کی دھری رہ گئی۔‘‘

[صدیقۂ کائنات:۱۰۶]

حکیم صاحب کی عبارتیں پڑھتے جائیں:

''اب ایک طرف بخاری کی نوسال والی روایت ہے اور دوسری طرف اتنے قوی شواہد و حقائق ہیں اس سے صاف نظر آتا ہے کہ نوسال والی روایت ایک موضوع قول ہے جسے ہم منسوب إلى الصحابة کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے۔'' [صدیقۂ کائنات:۱۰۶]

''ہار کو قدر مشترک جانتے ہوئے افک کی روایت پر غور کیا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ یہ طویل داستان بالکل من گھڑت ہے۔ اس داستان کے خالق نے نہایت ہوشیاری سے ''ہار'' کے گرد گھومنے والی ایک داستان تخلیق کی اور پھر چابکدستی سے اس کا سلسلہ رواۃ صدیقۂ کائنات ؓ تک پہنچا دیا ہے۔ وہ اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوا اس کا اندازہ ہماری سیرت کی کتابوں کی ورق گردانی سے بخوبی ہوسکتا ہے۔''

[صدیقۂ کائنات:۱۱۳]

''واقعہ افک کی روایت تو سالوں بعد وضع کی گئی اور امام بخاری سبائی امت کی اس عیاری کو سمجھ ہی نہ سکے۔'' [صدیقۂ کائنات:۱۱۴]

واقعہ افک پر بحث کرتے ہوئے مزید لکھا:

''غرض ابن شہاب سے جو پوری حدیث روایت ہے وہ کسی ایک سے روایت نہیں بلکہ چار راویوں کے مختلف کلام کا مجموعہ ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہی بزرگوار پوری حدیث کے مؤلف ہیں ابن شہاب منافقین و کذابین کے دانستہ نہ سہی نادانستہ ہی سہی مستقل ایجنٹ تھے اکثر گمراہ کن، خبیث اور مکذوبہ روایتیں انہیں کی طرف منسوب ہیں۔'' [صدیقۂ کائنات:۱۱۴]

حکیم صاحب لکھتے ہیں:

''بغض و کینہ سے ملوث خبث آلود عجمی ذہنیتوں نے اس زبدۂ کائنات کے اذکارِ جلیلہ میں جونیہ جیسی کسی فاحشہ کا ذکر بھی داخل کر دیا اور امام بخاری جیسے نابغۂ دوراں بھی اپنی سادگی کی وجہ سے اصح الکتب کو داغدار کرنے سے اپنا دامن نہ بچا سکے۔ یہ دراصل سورہ التحریم کی ابتدائی آیات کا رُخ امہات المؤمنین کی طرف گھمانے کے حربوں میں سے ایک حربہ تھا۔ حضرت صادق المصدوق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ترپن چون سال تک نیم مجردانہ زندگی گزارتے ہیں اور بقول عجمی ذہنیت کے جونہی اس عمر سے تجاوز فرماتے ہیں۔ بس جہاں کوئی خوب صورت عورت نظر آئی اپنے حرم میں داخل فرما دیا اور حجرات میں گھومنا شروع کر دیا۔ ان لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مصروفیات مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل کر کے رکھ دیں۔''

[صدیقۂ کائنات:۱۶۶]

حکیم صاحب کا ذکرِ خیر پروفیسر میاں محمد یوسف سجاد غیر مقلد کی کتاب ''تذکرہ علماء اہلِ حدیث پاکستان'' میں چھ صفحات پر مشتمل موجود ہے۔

اس کتاب میں لکھا ہے:

''مولانا حکیم فیض عالم صدیقی...خطیب جامع مسجد اہل حدیث محلّہ مستریاں جہلم۔''

[تذکرہ علماء اہلِ حدیث پاکستان: ۳/۲۲۶]

''جب اس تذکرہ علمائے اہلِ حدیث کی تدوین کا ذکر ہوا تو آپ نے کافی راہنمائی فرمائی۔ اور انہوں نے اس کتاب پر تقدیم وتقریظ لکھنے کا وعدہ فرمایا لیکن اس کام کی تکمیل سے قبل اس جہانِ فانی سے چل دیئے۔ اللہ مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا'' [تذکرہ علماء اہلِ حدیث پاکستان: ۳/۲۳۰]

''آپ کی اولاد میں سے آپ کے ایک صاحب زادے حافظ فیض الرحمٰن آپ کے جانشین کے طور پر جامع مسجد اہلِ حدیث محلّہ مستریاں جہلم میں اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔''

[تذکرہ علماء اہلِ حدیث پاکستان: ۳/۲۳۱]

''حکیم صاحب کا اندازِ فکر کچھ جُداگانہ اور تحقیق بڑی عمیق تھی مختلف مسائل پر آپ کا زاویہ نگاہ منفرد تھا۔ تحقیق کے میدان میں آپ نے انتہائی نازک مسائل پر طبع آزمائی کی ہے۔''

[تذکرہ علماء اہلِ حدیث پاکستان: ۳/۲۳۱]

''آپ نے مندرجہ ذیل کتب اپنی یادگار کے طور پر چھوڑی ہیں۔ ا۔ اختلاف امت کا المیہ حصہ اول۔ یہ کتاب ردتقلید کے موضوع پر لاجواب کتاب ہے۔'' [تذکرہ علماء اہلِ حدیث پاکستان: ۳/۲۳۱]

حکیم صاحب کی غیر مقلدیت پر مزید حوالہ جات حاشیہ: ۴۸۴ر میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

غیر مقلدین تین طلاقوں کو ایک کہتے ہیں اس میں وہ حدیث کو برتری دیتے ہیں یا اپنے بزرگوں کو؟ جواب دینے سے پہلے درج ذیل اعتراف پیشِ نظر رہے۔

علی زئی صاحب لکھتے ہیں:

''قلت: وصح بنحو المعنى عن ابن عباس وغيره من الصحابة رضى الله عنهم اجمعين، ولا يعرف لهم مخالف فى ايقاع الثلاث جميعافهذا اجماع وليس فى الكتاب والسنة مايعارضه۔[حاشیہ جزء علی بن محمد الحمیری: ۳۷/تحت حدیث: ۴۳]

ترجمہ: میں کہتا ہوں اوراسی طرح کا مطلب ابن عباس وغیرہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے۔ اکٹھی تین طلاقوں کے وقوع کے متعلق ان (صحابہ) کا کوئی مخالف معلوم نہیں، لہٰذا یہ اجماعی مسئلہ ہے اور کتاب وسنت میں ایسی کوئی بات نہیں جو اِس کے معارض ہو۔

خود علی زئی صاحب کا اپنا سلوک حدیثوں کے ساتھ کیسا ہے، اسے ''مقالاتِ اثریہ: ۵۸، ۳۶۶'' کے حوالہ سے حاشیہ: ۵۰۲ر میں ہم نقل کر چکے ہیں۔

۵۰۸

حدیث کے خلاف امتیوں کی پیروی کرنا!!!

چلیں جی علی زئی کے بیان فرمودہ معیار پر غیر مقلدین کو پرکھتے ہیں کہ وہ صحیح العقیدہ لوگوں کی طرح کتاب وسنت کے مقابلے میں ہر شخص کی بات کو چھوڑ دیتے ہیں یا اس کے برعکس قرآن وسنت کے خلاف ہر کسی کو بات کو گلے لگائے رہتے ہیں؟؟!

عبدالحق غزنوی غیر مقلد نے غیر مقلدین کے شیخ الاسلام اور ہیرو ثناء اللہ امرتسری کی تفسیر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''اس جگہ میں بھی تفسیر نبوی واہل سنت و جماعت کو چھوڑ کر فرقہ معتزلہ کی تفسیر کو پسند کیا۔''

[الاربعین:۱۳/حاشیہ]

''تفسیر نبوی جس سے دیدار الٰہی اور مذہب اہلِ سنت و جماعت ثابت ہوتا تھا چھوڑ کر جہمیہ ومعتزلہ وغیرہ منکرین دیدارِ الٰہی کا مقلد ہوگیا۔'' [حاشیہ الاربعین:۱۶]

''آیاتِ صریحہ اور احادیثِ صحیحہ اور اہلِ اسلام کو چھوڑ کر قفال کا مقلد بن کر عرش سے انکاری ہوا۔'' [الاربعین:۱۸]

عبدالجبار غزنوی غیر مقلد لکھتے ہیں:

''مولوی ثناء اللہ کی تفسیر عربی اکثر عاجز کی نظر سے گذری ہے اس میں شک نہیں کہ مولوی مذکور نے اپنی تفسیر میں بہت جگہ تفسیر نبوی اور تفاسیر خیر قرون اور تفاسیر اہل سنت و جماعت کو چھوڑ کر تفسیر جہمیہ اور معتزلہ وغیرہ فرق ضالہ کو اختیار کیا'' [الاربعین:۲۷]

محمد حسین بٹالوی صاحب لکھتے ہیں:

''حدیث نبوی کا یہ شخص در پردہ منکر ہے اور حدیث کے مقابلہ میں اپنی رائے اور اپنے اسلاف معتزلہ ونیچریہ کی آرائے کو واجب العمل اور مقدم سمجھتا ہے تب ہی احادیثِ صحیحہ نبویہ مفسرہ قرآن کو چھوڑ کر بہ تقلید معتزلہ ونیچریہ قرآن کی تفسیر رائے سے کرتا ہے'' [الاربعین:۴۴]

غیر مقلدین کا مخالفِ حدیث ہونا حاشیہ:۸۷، ۵۰۱/وغیرہ میں بھی مذکور ہو چکا ہے۔

۵۰۹

علی زئی صاحب نے صحیح العقیدہ گروہ کا نظریہ ذکر کیا کہ وہ قرآن وسنت کو برتری دیتے ہیں پھر اس گروہ کے افراد میں سے نمونہ کے طور پر سیدنا ابوبکر، سیدنا علی رضی اللہ عنہما اور امام شافعی رحمہ اللہ کا ذکر خیر کیا ہے۔

عرض ہے کہ یہاں ان مقدس شخصیات کا نظریہ زیر بحث ہے ہی نہیں۔علی زئی صاحب نے آگے چل کر اس صحیح العقیدہ گروہ کے بالمقابل باطل گروہ دیوبندیوں کو باور کرانے کی ناکام کوشش کی۔ان کی یہ کوشش کس قدر ناکام ہے قارئین آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمالیں گے، ان شاء اللہ۔

بہرحال علی زئی صاحب چونکہ اہلِ حدیث کو صحیح العقیدہ اور دیوبندیوں کو بدعقیدہ کہتے ہیں، اِس لیے انہیں چاہیے تھا کہ وہ دیوبندیوں کے مقابلہ میں غیرمقلدین کو پیش کر کے ثابت کرتے کہ وہ قرآن و حدیث کو برتری دیتے ہیں....مگر وہ ایسا نہ کر سکے،شاید انہیں معلوم تھا کہ اگر غیرمقلدین کے بارے میں کہا کہ وہ قرآن وحدیث کو برتری دیتے ہیں تو بُرا حشر ہوگا۔اس لیے وہ قرآن وحدیث کو برتری دینے والے لوگوں میں غیرمقلدین کی بجائے سیدنا ابوبکر، سیدنا علی رضی اللہ عنہما اور امام شافعی رحمہ اللہ کو پیش کر کے آگے چلتا بنے ہیں۔

۵۱۰

[الف]......سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا تذکرہ یہاں یہ بتانے کے لیے کیا گیا کہ وہ قرآن وسنت کو برتری دینے والے تھے۔مگر غیرمقلدین کا طرز عمل کیا ہے؟ خود علی زئی کی طرف سے اعترافی عبارات ہم اوپر نقل کر چکے کہ ان کے غیرمقلدین حدیث پہ حملے کیا کرتے ہیں۔

[ب]......سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں جب یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ وہ قرآن وسنت کو برتری دینے والے تھے لہٰذا جو اُن کی تقلید کرے، وہ راہ ہدایت پر سمجھا جانا چاہیے۔مگر غیرمقلدین کیا کہتے ہیں۔سنئے!

”اگر کوئی یہ کہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تقلید کی جائے تو وہ ہدایت پر نہیں رہتا۔“[خطبات بہاول پوری: ۳۳۰/۵]

شاید کوئی غیرمقلد کہہ دے کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ چونکہ معصوم نہیں اس لیے اُن سے خطاء ہو سکتی ہے لہٰذا باوجود قرآن وسنت کو برتری دینے والے جذبے کے، ان کی تقلید جائز نہیں۔

عرض ہے کہ علی زئی کو خاص کر اصرار ہے کہ سلف صالحین کے فہم کو مانا جائے تو سلف صالحین بھی معصوم نہیں، خطاء تو ان سے بھی ہو سکتی ہے پھر اُن کی پیروی جائز بلکہ ضروری کس طرح ہو گئی؟

۵۱۱

سیدنا علی رضی اللہ عنہ تو فرما رہے ہیں کہ ”سنت کو کسی کے قول پر چھوڑ نہیں سکتا“ مگر غیرمقلدین اقوالِ امت کے مقابلہ میں سنت کو چھوڑنے میں کس قدر جری ہیں اس کی کچھ جھلکیاں ہماری اسی کتاب ”زبیر علی زئی کا تعاقب“ میں جگہ بہ جگہ موجود ہیں۔دیکھئے حواشی: ۸۷۔۱۲۵، ۵۰۱، ۵۰۷، ۵۰۸/وغیرہ۔

۵۲۱

[الف]......ہم اپنی اسی کتاب میں حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا حوالہ ان کی کتاب ''فتاویٰ: ۲۰۳/۲'' سے نقل کر چکے ہیں کہ ائمہ کا تقلید سے روکنا صرف مجتہدین کو ہے۔ دیکھئے! حاشیہ: ۱۵۹۔

یا پھر اس جگہ تقلید مذموم کی ممانعت ہے جو انگریز سے اہلِ حدیث نام پانے والے کیا کرتے ہیں جیسا کہ ہماری اسی کتاب میں متعدد مقامات پر خود ان کی اعترافی عبارات باحوالہ درج ہیں دیکھئے حاشیہ: ۴۵/وغیرہ۔ کچھ حوالے آئندہ چند سطروں بعد بھی مذکور ہوں گے ان شاء اللہ۔

رہی تقلید محمود وہ تو محمد حسین بٹالوی کے بقول ابن حزم کے علاوہ سبھی علماء کے ہاں جائز ہے جیسا کہ حاشیہ: ۱۵۹/ میں اشاعۃ السنۃ: ۳۱۴/۱۱/ کے حوالہ سے مذکور ہوا۔

تقلید محمود تو امام شافعی رحمہ اللہ خود کرلیا کرتے تھے جیسا کہ ان کا اپنا اعتراف ''کتاب الام'' وغیرہ کتابوں کے حوالہ سے پہلے ہم درج کر چکے ہیں۔

[ب]......علی زئی صاحب کے بقول امام شافعی رحمہ اللہ کا فرمان ہے کہ حدیث نبوی کے مقابلہ میں میری تقلید نہ کرو۔ اب دیکھتے ہیں کہ اہلِ حدیث کہلوانے والے امام شافعی رحمہ اللہ کی اس نصیحت پر کتنا عمل کرتے ہیں؟

علی زئی صاحب لکھتے ہیں:

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء میں تین دن سے زیادہ قربانی کا گوشت رکھنے سے منع فرمایا تھا، بعد میں یہ حکم منسوخ ہوگیا۔ یہ ممانعت اس کی دلیل ہے کہ قربانی تین دن ہے والا قول ہی راجح ہے۔''

[توضیح الاحکام: ۱۸۱/۲]

علی زئی صاحب ہی لکھتے ہیں:

''امام شافعی اور عام اہلِ حدیث علماء کا یہی فتویٰ ہے کہ قربانی کے چار دن ہیں۔''

[توضیح الاحکام: ۱۸۰/۲]

علی زئی صاحب کی ان تحریروں سے عیاں ہے کہ از روئے حدیث تین دن قربانی کرنا ہی راجح ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ چار دن قربانی کے قائل ہیں اور عام اہلِ حدیث نے بھی اسے اختیار کیا ہوا ہے۔

بتایئے! ایامِ قربانی کے مسئلہ میں عام غیر مقلدین نے بزعم علی زئی حدیثِ نبوی کی پیروی کی ہے یا امام شافعی رحمہ اللہ کی؟

شہید کا جنازہ پڑھنا حدیث سے ثابت ہے۔ [الحدیث اکتوبر ۲۰۰۵ء] امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک شہید کا جنازہ نہیں۔ غیر مقلدین کا ایک طبقہ اس مسئلہ میں امام شافعی رحمہ اللہ کی رائے قبول کیے ہوئے

ہے، حوالے پہلے درج ہو چکے ہیں۔ دیکھئے حاشیہ: ۱۲۵

غیر مقلدین کی کتاب ''دستور المتقی'' میں لکھا ہے:

''کسی مقام میں اگر صرف چار روز قیام کرنے کی نیت کی ہے تو نماز قصر پڑھے۔''

[دستور المتقی: ۱٦٦]

غیر مقلد محشی نے اس جگہ حاشیہ میں لکھ دیا:

''یہ شافعیہ کا مذہب ہے اہلِ حدیث کے نزدیک ۱۹/ روز تک قصر کرنا چاہیے۔'' [حوالہ مذکورہ]

بتائیں! دستور المتقی کے غیر مقلد مصنف نے شافعیہ کی پیروی کی ہے یا نہیں؟

ہماری معلومات میں بہت سے ایسے مسائل ہیں جن میں غیر مقلدین نے امام شافعی رحمہ اللہ کی رائے کو قبول کیا ہوا ہے مگر علی زئی وغیرہ آلِ غیر مقلدیت کی کتابوں میں ان مسائل کے خلاف احادیث موجود ہیں۔ اگر کسی غیر مقلد سپوت کو ہمارے اس دعوی سے اختلاف ہے تو وہ ہمیں چیلنج کرے، ہم ان شاء اللہ غیر مقلدین کی کتابوں سے اپنے اس دعویٰ کی صداقت پر بھرپور دلائل دیں گے۔ آیئے! اس عنوان پر بھی طبع آزمائی کر لیتے ہیں۔ ہے کوئی غیر مقلد جو ہمیں اس عنوان پر لکھنے کے لیے چیلنج کرے؟

چھُپ چھُپ کر تقلید کرنے والے اہل حدیثوں کی اندرونی داستان:

[ب]......علی زئی صاحب دعویٰ کر رہے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے تقلید سے روکا ہے جس کا جواب اوپر مذکور ہو چکا۔ مزید ہم علی سبیل التنزل کہتے ہیں کہ خود اہلِ حدیث کہلوانے والوں کا امام شافعی رحمہ اللہ کے اس فرمان پر عمل نہیں، وہ چھُپ چھُپ کر تقلید کیا کرتے ہیں۔ ثبوت ملاحظہ ہوں۔

عبدالجلیل سامرودی غیر مقلد نے قبر پر مٹی ڈالتے وقت منھا خلقنکم ... پڑھنے کو غیر ثابت بتلانے پر ایک مضمون تحریر کیا۔ اس میں اپنی جماعت کے چار بڑے ستونوں بالفاظ دیگر اپنے مسلک کے ائمہ اربعہ کو مکھی پر مکھی مارنے والا تقلیدی قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو!

سامرودی صاحب لکھتے ہیں:

''امام شوکانیؒ نے اپنی تفسیر میں مسند احمد اور امام حاکم سے یہی ام کلثومؓ والی روایت بیان کی ہے ساتھ ہی محولا بالا ابن کثیرؒ کا مضمون تقلیداً نقل کر دیا ہے، نہ کہ تحقیقاً۔ ہمارے والا جاہ صدیق الحسن بھوپال نے بھی اپنی تفسیر فتح البیان میں امام شوکانیؒ کی تقلید اور انہی کی تفسیر کی عبارت نقل کر دی صرف مکھی پر مکھی ماری، کسی تحقیق کے طریقہ سے نہیں لکھا۔ اب ان سے قدرے نیچے آیئے۔ مولانا وحید الزمانؒ مترجم صحاح ستہ ابن ماجہ کے ترجمہ میں نواب قطب الدین دہلویؒ کی مظاہر الحق کی تقلید میں وہی مضمون لکھتے ہیں.. .انتھی یہ عبارت مظاہر الحق کی ہے اسی عبارت کو مترجم ابن ماجہ مولانا وحید الزمان نے بھی نقل کر دیا وہی مکھی پر مکھی ماری

گئی ہے۔ مجھے اپنے مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارک پوریؒ پر تعجب ہے کہ ایک مشہور محقق ہوتے ہوئے اپنی کتاب الجنائز کے صفحہ ۴۵/ پر علمائے حنفیہ اور شافعیہ سے مستحب ہونے کو لکھ کر اس کی تائید میں لکھتے ہیں...."

[فتاویٰ علمائے حدیث: ۲۸۶/۵]

شوکانی، نواب صدیق حسن اور وحید الزمان اہل حدیث کہلائے جاتے ہیں مگر سامرودی صاحب غیر مقلد کے بقول یہ لوگ تقلیدی روش اپنانے اور مکھی پر مکھی مارنے والے ہیں، حتی کہ عبدالرحمٰن مبارک پوری بھی حنفیہ وشافعیہ کی دہلیز پر جا بیٹھے۔

سامرودی صاحب آگے لکھتے ہیں:

"خداوند کریم تقلید کا منہ کالا کرے، اس مرض نے اچھوں اچھوں کو نہیں چھوڑا۔"

[فتاویٰ علمائے حدیث: ۲۸۶/۵، مکتبہ اصحاب الحدیث لاہور]

اس عبارت میں "اچھوں اچھوں" سے مراد سامرودی صاحب کے نزدیک شوکانی ونواب صدیق حسن وغیرہما ہیں جو تقلید کی گود میں رونق افروز ہوئے۔ یہاں سامرودی صاحب کی مہربانی بھی معلوم کرتے چلیں، انہوں نے "تقلید کا منہ کالا" تو کہہ دیا مگر اس تقلید کے راہی اپنے بزرگوں کی طرف "منہ کالا" کی نسبت نہیں کی۔

پروفیسر عبداللہ بہاول پوری غیر مقلد کہتے ہیں:

"اب یہ سجدے سے اُٹھنا جیسے آٹا گوندتے ہیں یہ مسئلہ ایسا ہے کہ البانی چکر میں پڑ گیا۔ اس کی وجہ سے ساری اہلِ حدیث جماعت اس طرف لگ گئی، سب کے سب اس میں پڑ گئے۔"

[خطبات بہاول پوری: ۱۴۸/۴]

ایک غیر مقلد لکھاری صاحب لکھتے ہیں:

"ہم شیخ البانی کی عزت کرتے ہیں ان کے علمی مقام ومرتبہ کا اعتراف کرتے ہیں مگر اس کے باوجود ہم شیخ کی ان غلطیوں سے چشم پوشی نہیں کرتے جن کی وجہ سے پوری دنیا میں ذہنی انتشار لوگوں میں پھیل رہا ہے اور لوگ اس وجہ سے آنکھیں بند کر کے اپنا رہے ہیں کہ یہ شیخ البانی کی رائے ہے۔ شیخ الالبانی خود امام ابن حزم رحمہ اللہ کی علمی قدر کے معترف ہیں مگر ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ صفات میں خالص جہمیہ ہیں۔ اسی طرح ہم بھی شیخ الالبانی کی علمی قابلیت ولیاقت کے اعتراف کے باوجود یہ کہتے ہیں کہ شیخ الالبانی ایمان، وعد، وعید میں خالص جہمیہ ہیں۔ ہم صرف دعویٰ نہیں کرتے بلکہ عنقریب آئندہ صفحات میں قارئین کے سامنے اپنی بات مدلل ثابت کر دیں گے ان شاء اللہ۔"

[حق اتباع باطل کا رد کیا ضروری نہیں؟ شیخ ناصر الدین الالبانی کی کیسٹ الکفر کفران پر تبصرہ وتنقید: ۱۰]

مذکورہ عبارتوں کا حاصل یہ ہے کہ اہلِ حدیث ہونے کے دعوے دار آنکھیں بند کر کے البانی کی تقلید کیا کرتے ہیں۔

البانی کی تقلید کرنے والے اہلِ حدیثوں کی نشاندہی پر ہم ابوالاشبال شاغف اور خواجہ محمد قاسم وغیرہما آلِ غیر مقلدیت کے بھی حوالے پہلے نقل کر چکے ہیں۔

[ج]......علی زئی صاحب مدعی ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی تقلید سے روکا ہے۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ اہلِ حدیث کہلائے جانے والوں کا حال یہ ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کی تقلید سے باز آنا تو دُور رہا، وہ تو گمراہوں کی تقلید سے بھی نہیں چوکے۔ ثبوت حاضر ہیں۔

غیر مقلدین میں ''وکیل اہلِ حدیث کا لقب پانے والے مصنف'' محمد حسین بٹالوی صاحب لکھتے ہیں:

''اس وقت صاحبان اخبار اور دیگر مہذب ناظرین اخبار سے بڑے ادب کے ساتھ التجا کرتے ہیں کہ وہ بھی اس بارہ میں گورنمنٹ کی صلح کل پالیسی کی تقلید کریں اور بجائے وہابی کے ہمیشہ اہلِ حدیث کا لفظ اس فرقہ کی نسبت استعمال کیا کریں۔'' [اشاعۃ السنہ جلد ۹، نمبر ۷، صفحہ ۲۱۲/عنوان فرقہ اہلِ حدیث اور انگریز]

لو جی! بٹالوی صاحب نے انگریز حکومت کی تقلید کا حکم دے دیا۔

عبدالحق غزنوی غیر مقلد نے ثناء اللہ امرتسری کے متعلق لکھا:

''اہلِ سنت کی تفاسیر چھوڑ کر ابو مسلم اصفہانی معتزلی کا مقلد بنا۔'' [الاربعین حاشیہ: ۸]

عبدالحق غزنوی غیر مقلد مزید لکھتے ہیں:

''اہل سنت کی تفاسیر چھوڑ کر ابو مسلم اصفہانی معتزلی کا مقلد بنا۔'' [الاربعین: ۱۱/حاشیہ]

غزنوی صاحب ہی لکھتے ہیں:

''مصنف تفسیر ثنائی نے تمام اہلِ سنت کو چھوڑ کر ابو مسلم اصفہانی ملحد مزاج معتزلی کے قول کی تقلید اختیار کی ہے۔'' [الاربعین: ۱۵]

غزنوی صاحب لکھتے ہیں:

''مصنف تفسیر ثنائی نے برخلاف تمام تفاسیر اہلِ سنت و جماعت کے ابو مسلم صفہانی معتزلی کی تقلید کر کے عقدت ایمانکم سے خاوند اور بیوی مراد لی ہے۔'' [الاربعین: ۱۱]

اس طرح کے مزید حوالہ جات ہماری اسی کتاب ''زبیر علی زئی کا تعاقب'' میں متعدد مقامات پر موجود ہیں۔ ہماری دوسری کتاب ''غیر مقلد ہو کر تقلید کیوں؟'' میں بھی ایسے حوالہ جات ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

☆......☆......☆......☆

مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ مدظلہ [اقتباس، از: اداریہ ماہنامہ بینات، رمضان ۱۴۴۱ھ]

عذاب سے نجات کے لیے مساجد کو آباد اور فتنۂ تصویر ختم کیا جائے

☆......مدارس ومساجد اور جامعات میں قرآن کریم کی تلاوت ہوتی ہے، احادیث کو پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے، جس میں بار بار درود شریف پڑھا جاتا ہے۔ جہاں قرآن کریم کی تلاوت ہوتی ہو، اللہ تعالیٰ کا بار بار نام لیا جاتا ہو، درود شریف پڑھا جاتا ہو، وہاں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نزول ہوتا ہے، وہاں رحمت کے فرشتوں کا بسیرا ہوتا ہے، یہ تو پورے ملک سے وبائی امراض کے دفع کرنے کے مراکز ہیں۔ آپ ان کو بند کرکے گویا اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے نزول کو روکنا چاہ رہے ہیں۔ اس کرونا وائرس کی روک تھام کے لیے سعودی عرب اور عرب امارات نے بہت سارے اقدامات کیے، لیکن مساجد کا نمازیوں کے لیے بند کرنا ان کا ایسا اقدام ہے جو شرعاً ناجائز ہے۔ ایسے حالات میں تو مساجد کو آباد کرنے کی ضرورت ہے۔

☆......"آج ہمارے علماء کرام اور دین دار طبقہ میں ایک گناہ بہت زیادہ کیا جارہا ہے اور وہ ہے موبائل کے ذریعہ تصویریں بنانے کا شوق، اور وہ بھی اللہ کے گھر میں، مساجد، مدارس اور دینی تقریبات میں۔ حد تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے گھر کعبۃ اللہ کو پیٹھ کرکے لوگ تصویریں بنارہے ہوتے ہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ کو غصہ نہیں آئے گا؟ اللہ ان کو اپنے گھر سے دفع نہیں کرے گا؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم نہیں آئے گا کہ جاؤ نا! تم اتنے ناپاک ہوگئے ہو کہ ہمارے گھر میں آنے کے قابل نہیں رہے۔ اور دوسری طرف ہمارے دینی مدارس اور مساجد میں قرآنی تقریبات اور ختم بخاری کی تقریبات بڑے دھوم دھام، فخر ومباہات اور اسراف وتبذیر کے ساتھ ہورہی ہیں، جو بجائے کم ہونے کے اور زیادہ بڑھ رہی ہیں اور انہی دینی تقریبات اور روحانی محافل میں جو اللہ تعالیٰ کے گھر (مساجد) میں جہاں رحمت کے فرشتوں کا بسیرا ہوتا ہے، قرآن کریم اور احادیث موجود ہوتی ہیں، لیکن ہمارے علمائے کرام، طلبہ اور دین دار لوگوں کی دھڑا دھڑ موویاں بن رہی ہوتی ہیں، لائیو پروگرام نشر ہورہے ہوتے ہیں، تصویریں اور فوٹو گرافی ہورہی ہوتی ہے، اور کوئی ان کو روکنے والا نہیں۔ اس منکر کے خلاف کوئی کھل کر مخالفت نہیں کرتا، تو اب اللہ تعالیٰ کا غضب اور قہر نازل نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟

ہمارے علمائے کرام اور مفتیانِ عظام کو چاہیے کہ وہ بیٹھ کر متفقہ طور پر یہ بات طے کریں کہ کم از کم دینی تقریبات، خصوصاً قرآن کریم، ختم بخاری کی تقریبات کو اس گناہِ بے لذت سے پاک رکھیں اور مساجد میں فوٹو اور تصویر کھینچنے اور مووی بنانے کو ناجائز، حرام اور گناہ قرار دیں، تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی کم ہوگی اور اس طرح کی وبائیں، امراض، آفات اور مصائب وآلام رک جائیں گے۔ اگر ہم نے اللہ تعالیٰ کے گھروں کا اکرام نہ کیا تو اللہ تعالیٰ اسی طرح اپنے گھروں سے ہمیں نکال دیں گے، **ولا فعل اللّٰہ ذٰلک۔**"

فَلِمَا تخافُ المَوتَ مِنْ ''کُورُونَا''

۱۔ مَالِي أَرَاکَ مِنَ الْوَبَا مَفْتُونَا	وَتَکَادُ رُعْبًا أَنْ تُجَنَّ جُنُونَا
۲۔ إِنْ کَانَ مَوتُکَ لَامَحَالَةَ آتِيًا	فَلِمَا تَخَافُ المَوتَ مِنْ ''کُورُونَا''
۳۔ قَدْ مَاتَ بِالطَّاعُونِ قَومٌ قَبلَنَا	مَا بَالُ مَن لَم يُدرِکِ الطَّاعُونَا
۴۔ مَن لَمْ يَمُتْ بِالطَّعنِ مَاتَ بِغَيرِهٖ	فَالْمَوتُ حَقٌّ وَالْوَرىٰ فَانُونَا
۵۔ إِنَّ الَّذِي کَتَبَ الْبَقَاءَ لِنَفْسِهٖ	کَتَبَ الْفَنَاءَ عَلَى الوَرىٰ قَانُونَا
۶۔ لَو کَانَ ذُخرُکَ صَالِحًا مَا خِفْتَهٗ	لٰکِنْ حَمِلتَ مِنَ الذُّنُوبِ دُيُونَا
۷۔ اَللّٰهُ أَنْذَرَ بِالْوَبَاءِ عِبَادَهٗ	اَللّٰهُ حَرَّکَ بِالْبَلَاءِ سُکُونَا
۸۔ سُبْحَانَ مَن يُنْجِي العِبَادَ بِفَضْلِهٖ	وَيُقِرُّ مِنْهُمْ أَنفُسًا وَّعُيُونَا
۹۔ اِعْمَلْ لِنَفْسِکَ قَبْلَ مَوْتِکَ صَالِحًا	فَالْمُتَّقُونَ لَهٗ هُمُ النَّاجُونَا

(۱)۔کیا بات ہے کہ میں تجھے وبا کی وجہ سے فتنے میں مبتلا دیکھ رہا ہوں؟ کہیں وبا کے رعب سے تجھ پر غشی نہ طاری ہوجائے۔......(۲)۔اگر تیری موت نے ہر حال میں آنا ہی ہے،تو پھر کورونا کے باعث موت سے کیوں ڈر رَہا ہے؟......(۳)۔ہم سے پہلے بہت سے لوگ طاعون کی وجہ سے مر گئے،اُن لوگوں کا کیا ہوا جو طاعون میں مبتلانہیں ہوئے؟......(۴)۔جو نیزے کے وار سے نہ مرے وہ ویسے بھی مر ہی جاتا ہے،موت برحق ہے اور مخلوق فانی ہے۔......(۵)۔جس ذات نے اپنے لیے بقا کا فیصلہ لکھا ہے،اُسی ذات نے مخلوق کے لیے فنا کا قانون لکھ دیا ہے۔......(۶)۔اگر تیرے پاس نیک اعمال کا ذخیرہ ہوتا تو تُو اِس وبا سے نہ ڈرتا،لیکن افسوس کہ تو نے گناہوں کا بوجھ اپنے اوپر لاد رکھا ہے۔......(۷)۔اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو وبا کے ذریعہ ڈرایا ہے،اور اس مصیبت کے ذریعہ سکون کو ہلچل میں بدل دیا ہے۔......(۸)۔پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندوں کو اپنے فضل سے نجات دیتی ہے،اور اُن کی وجہ سے جانوں اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔......(۹)۔اپنی موت سے پہلے پہلے اپنے لیے نیک اعمال کرلے،اللہ سے ڈرنے والے ہی دراصل نجات یافتہ ہیں۔

دارالامین لاہور میں دستیاب کتب ورسائل

شمار	نام کتاب	مصنف	طبع	کیفیت	صفحات	قیمت
۱	ذکرواعتکاف میں بدعات	مولانا محمد صدیقؒ	چہارم	کارڈ	۷۲	40
۲	عمار خان کا نیا اسلام	مفتی عبدالواحدؒ	سوم	کارڈ	۴۲۸	250
۳	تحفہ غامدی	مفتی عبدالواحدؒ	دوم	آرٹ	۶۴	40
۴	غم زدوں کو بشارت	مفتی محمد شریف	دوم	کارڈ	۴۸	30
۵	برصغیر میں اسلام کی آمد	مولانا عبدالحق بشیر	سوم	مجلد	۱۹۲	150
۶	نماز تراویح اور اہل حدیث	مولانا عبدالحق بشیر	دوم	مجلد	۱۸۴	130
۷	قادیانی نبوت کے نشیب قادیانی کا	مولانا عبدالحق بشیر	دوم	مجلد	۹۶	60
۸	فقہی مذہب	مولانا عبدالحق بشیر	اول	مجلد	۲۰۸	130
۹	حیات النبی اور مولانا سخی داد	مولانا عبدالحق بشیر	اول	کارڈ	۷۲	40
۱۰	فضائل اعمال کا عادلانہ دفاع	مولانا مفتی رب نواز	دوم	مجلد	۵۱۲	250
۱۱	تحفظ عقائد اہل سنت	مولانا مفتی رب نواز	دوم	مجلد	۸۹۶	350
۱۲	علماء دیوبند کے خلاف سازشیں	مولانا عبدالرحیم چاریاری	اول	مجلد	۴۲۴	250
۱۳	کرنیں ایک ہی مشعل کی	مولانا عبدالرحیم چاریاری	دوم	مجلد	۳۲۶	200
۱۴	سیدنا عمرو بن العاصؓ	انجم نیازی	اول	مجلد	۲۲۴	140
۱۵	سیدہ خدیجۃ الکبریٰؓ	انجم نیازی	اول	مجلد	۲۱۶	120
۱۶	حیات النبی کی خوشبوئیں	انجم نیازی	اول	مجلد	۱۹۲	120
۱۷	حقیقت میلاد نمبر	مجلّہ صفدر اشاعت خاص	اول	آرٹ	۹۶	70
۱۸	مشاجرات صحابہ و مسلک اعتدال	مولانا مجیب الرحمٰن	اول	آرٹ	۵۶	25
۱۹	امام اہل سنتؒ اور افکارِ علوی مالکی	مجلّہ صفدر اشاعت خاص	دوم	آرٹ	۵۶	25
۲۰	عقیدہ امامت اور اکابر اہل سنت	مجلّہ صفدر اشاعت خاص	اول	آرٹ	۴۸	25